☆

میں نے ادیان کے بارے میں گہرے تفکر میں تحقیق کی۔
اورانہیں کئی شاخوں والی جڑوں کی طرح پایا۔
کسی سے اس کے دین کے بارے میں مت پوچھو
(ایسا کرنا) اسے جڑ سے جدا کر دینا ہے
اصل اسے ڈھونڈ لے گا
جیسے جیسے معنی آشکار ہوں گے وہ جان لے گا۔

حسین بن منصور حلاج

IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

پیش لفظ

موضوع کے بارے میں

مذہب نے نوع انسان کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس نے معاشرے کو اخلاقی ضوابط،سماجی قوانین اور تصورات،رسومات،بھگتی،یوگا،اسطوریات،تصوف، فلسفہ وغیرہ مہیا کیا۔اس نے بلند تر قوموں کے ساتھ تعلق بنانے کی راہیں عیاں کیں۔اس نے تلاش حق،حصول ذات،وصال الٰہی اور ابدیت پانے کی بنیادیں رکھیں۔اس نے زندگی کو پاکیزگی، نظم وضبط اور رفعت دی۔اس نے معاشرے کو منظم اور سرفراز کیا۔اور مخفی الوہی قوتوں کو آشکار کیا۔اس نے فیض رسانیوں اور لطیف نظریات کے ذریعے تہذیبوں اور ثقافتوں کے مختلف میدانوں کو بھرپور بنایا۔تمام مذاہب کے بنیادی مسائل ایک سے ہیں۔شعور کی بلندی کی جانب جانے کے لئے مسلسل پیش قدمی کی، تاکہ نجات اور وصال الٰہی نصیب ہو۔زندگی کو الوہی بنانا اور زمین پر افلاک کی بادشاہت قائم کرنا۔مذاہب عالم صرف اپنے ظاہری طریقوں اور ان کے مسائل کا حل پانے کے لئے عقلی انداز فکر میں ہی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

پرانے نظریات اور استدلال کے نئے نظریات کے مابین بین الاقوامی تضادات کے موجودہ اہم دور میں یہ نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ ہم تمام مذاہب کی عملی اہمیت کی حامل ہمہ گیر صداقتوں سے شناسائی حاصل کریں۔یہ شناسائی، سچ، محبت، امن، اتحاد، مہربانی، پاکیزگی، ضبط نفس، خیرات اور مسرت کی بنیادی تعلیمات کو سمجھنے میں انسانیت

کے لئے مددگار ہوگی۔اس سے تمام مذاہب کی اساسی یکسانیت اور اتحاد کا احساس ملے گا۔

ڈاکٹر امولیہ رنجن مہا پتر کی تصنیف کردہ زیر نظر کتاب ''فلسفہ مذاہب''ان تمام لوگوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔جو جامع اور مختصر انداز میں تمام اہم مذاہب عالم کی تعلیمات کا جوہر جاننے کے خواہش مند ہیں۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں دنیا، روحوں، خدا،عمل، گناہ، پابندی اور نجات لافانیت اور مذہبی تجربہ وغیرہ پر آسان اور قابل فہم انداز میں بات کی گئی ہے۔دوسرا حصہ دنیا کے دس اہم اور بڑے مزاہب مثلاً اسلام، عیسائیت، ہندومت، یہودیت وغیرہ کے بنیادی نظریات بیان کرتا ہے۔مصنف اپنی محنت اور تحقیق کے لئے تعریف وتحسین کا مستحق ہے۔

یہ کتاب یقیناً ہر باشعور انسان میں غیر متعصب سوچ بچار کی تحریک پیدا کرتی ہے۔دانشوروں کے علاوہ قارئین بھی اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مصنف کے بارے میں:

امولیہ رنجن مہا پتر فلسفہ اور پولیٹیکل سائنس میں ایم،اے،کی ڈگری رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے روسی زبان میں ڈپلومہ اور ایل،ایل،بی کیا۔انہیں تین سال کے لئے یو،جی،سی،ٹیچر فیلوشپ کا اعزاز ملا۔انہوں نے 1981ء میں پونا یونیورسٹی سے پی،ایچ ڈی اور 1989ء میں ڈی لٹ کیا۔ہندوستان کے مختلف تحقیقی اداروں نے انہیں متعدد اعزاز،جب کہ انڈو جمعن فرینڈ شپ سوسائٹی،تاشقند ریڈیو اور ایسٹرولوجیکل ریسرچ سینٹر کٹک نے کئی تمغے اور سرٹیفیکیٹ

دیئے۔ امولیہ رنجن نے اڑیہ اور انگلش زبانوں میں متعدد کتب تصنیف کیں اور جریدوں میں تحقیقی مضامین تحریر کیے۔ وہ بہت سی انجمنوں اور ثقافتی تنظیموں سے وابستہ رہیں۔

ترجمہ کے بارے میں:

راقم الحروف کو یہ کتاب ترجمہ کرنے کا خیال اس وقت آیا، جب میں اپنی ترجمہ کردہ ایک اور کتاب "مشرق کے عظیم مفکر" میں زرتشت کے بارے میں مضمون شامل کرنے کے لئے مواد ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کتاب میں سے زرتشت مت والا حصہ بہت جامع اور آسان فہم محسوس ہوا، تو ساری کتاب پڑھنے کے بعد اسے اردو میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اردو زبان میں فلسفہ مذہب کے موضوع پر کتب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ترجمہ کرنے کے دوران میں نے قاری کو فلسفے کا شوقین تصور کیا، امید ہے اس کا یہ شوق ناگزیر مشکل الفاظ کو تفہیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دے گا۔

یاسر جواد

فروری 1998ء

لاہور پاکستان

حصہ اول

فلسفہ مذہب

انسان ایک منطقی حیوان ہے، اور منطق ہی اسے دیگر حیوانوں سے
مختلف بناتی ہے۔ (ارسطو)

دنیائے قدیم میں مذہب اور فلسفہ کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ مذہب نے فلسفہ میں عروج پایا۔ اور فلسفہ مذہب کی جڑوں میں سرایت کر گیا۔ ان دونوں کے درمیان خیالات اور فکر کا متواتر باہمی تبادلہ موجود ہے۔ فلسفہ اور مذہب کا تعلق بہت قریبی اور ہم آہنگ ہے۔ جسے فلسفہ کے بطور ''فلسفہ مذہب'' جانی جانے والی مخصوص شاخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فلسفہ مذہب اور اس کی اہمیت کو جاننے کے لئے ہمیں سب سے پہلے فلسفہ اور مذہب کی تعریفوں اور نظریات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

فلسفہ کیا ہے؟۔

فلسفہ کا مبتدی پریشان ہو جاتا ہے۔ کہ مختلف فلسفیوں نے فلسفہ کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں۔ کچھ نے نفسیاتی امور پر زور دیا ہے۔ تو کچھ دیگر نے اقدار کو زیادہ اہمیت دی۔

لفظ (''Philosophy'') (فلسفہ) یونانی الفاظ (Philos) یعنی محبت اور ''Sophia'' یعنی دانش سے ماخوذ ہے۔ لہذا اس کا مطلب دانش سے محبت بنا، اصطلاح دانش اپنے مفہوم میں بھرپور ہے۔ اور یہ تجربی اور عقلی علم کا مجموعہ ہی نہیں، بلکہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی تحسین اور تشخیص بھی ہے۔ جان ڈیوی کے مطابق جب بھی فلسفہ کو سنجیدگی سے لیا گیا، اس نے ہمیشہ دعویٰ کیا کہ یہ ایسی دانش پر دلالت کرتا ہے کہ جو طرز

حیات کو متاثر کردے۔ سیسرو (cicero) نے فلسفہ کو یوں بیان کیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہدایت کار، نیکی کا دوست اور بدی کا دشمن ہے۔ وائنڈل ہینڈ (windle hand) کہتا ہے کہ ''فلسفہ ہمہ گیر قدر کی تنقیدی سائنس ہے۔'' ہربرٹ سپنسر کے خیال میں ''ایک کائناتی سائنس کی حیثیت میں فلسفے کا تعلق ہر چیز کے ساتھ ہے۔'' ارسطو کے مطابق فلسفہ ایک ایسی سائنس ہے جو سچائی پر غور وخوض کرتی ہے۔ افلاطون نے کہا ''فلسفہ جینے اور مرنے کا ایک انداز ہے۔'' لڈویگ وٹگنسٹین کا کہنا ہے، ''فلسفہ زبان کے ذریعہ ہماری ذہانت کی فریفتگی کے خلاف جنگ ہے۔''

مغرب میں فلسفہ کا تصور ہندوستانی تصور کا ہم پلہ نہیں۔ فلسفہ کے لئے بالعموم سنسکرت کا لفظ ''درشنم'' استعمال ہوتا ہے۔ جس کا لفظی مطلب ''دیکھنا ہے'' اور ہندوستانی فلسفیانہ نظاموں کا آغاز کسی قدیم اصول سے ہوا، اور نہ ہی مشاہدہ کردہ حقیقتوں سے (جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔) بلکہ اس کی ابتداء کسی ماورائی احساس سے ہے۔ جس میں کائنات کی نوعیت کے متعلق سچائی براہ راست حاصل ہوتی ہے۔

ہندوستان کا فلسفہ فکر اور خیالات کی جمع کاری کا نتیجہ نہیں، جن کی اشاعت تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف فلسفیوں نے کی ہو۔ یہ طاقت ور بیج میں سے ایک ایسے شاخوں اور پھلوں والے تنومند درخت کی نامیاتی نشوونما جیسا ہے۔ جو محض اپنی اندرونی نشوونما اور امتیاز کے ذریعہ خود کو منکشف کرتا ہے۔ نہ کہ بیرونی نموپذیری کے ذریعہ۔

فلسفہ اور زندگی

مشرق میں فلسفہ زندگی کا فن اور زندگی گزارنے کا انداز ہے۔ ہندوستانی ذہن کے مطابق فلسفیانہ استدلال کا مناسب مقصد محض اپنے لئے نہیں، بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کی خاطر علم حاصل کرنا ہے۔ حکمت کا مطلب صرف فلسفہ پڑھنا اور جاننا نہیں، بلکہ فلسفیانہ انداز میں سوچنا اور محسوس کرنا بھی ہے۔ فلسفہ کا آغاز حیرت، شک اور تجسس سے ہوا، یہ انسانی وجود کے مسائل کے بارے میں ہماری بڑھتی

ہوئی آگہی سے نمو پذیر ہوتا ہے۔فلسفہ ہماری زندگی کے مشکل اور غیر حل شدہ مسائل کا سامنا کرنے سے کتراتا نہیں۔ایسے دائمی مسائل موجود ہیں، جن سے نوع انسانی کو دل چسپی ہے۔اور جن کے جواب فلسفیوں نے تلاش کیے ہیں۔فلسفہ کا تعلق بنیادی طور پر روح، خدا، لافانیت، دنیا، علم اور ایسے ہی دیگر مسائل سے ہے۔جن کا حل ایک مرتبہ پھر زندگی کے موزوں نکتہ نظر میں ہے۔تاہم متعدد سوالات کے جواب عارضی طور پر دیئے گئے ہیں۔اور متعدد مسائل ہنوز حل طلب ہیں۔جیسا کہ تھورو نے کہا تھا۔"فلسفی ہونا محض پیچیدہ سوچیں سوچنا نہیں" اور نہ ہی کسی مکتب کی بنیاد رکھنا ہے۔بلکہ یہ ہدایت کے مطابق سادگی، خود انحصاری، اعتماد اور بلند نظری کی زندگی گزارنے کے لئے دانش سے محبت کرنا ہے۔

عقیدہ اور مذہب

فلسفہ کے ساتھ ساتھ مذہب بھی نوع انسانی کی فکر پر غالب رہا ہے۔مذہب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔کیونکہ یہ نمو پاتی ہوئی، متحرک چیز، بسیط، ذاتی، اور نفس مضمون میں وسیع ہے۔درحقیقت مذہب خصوصی اعتبار سے ایسی چیز ہے، جسے محسوس اور تجربہ کرنا پڑتا ہے۔نہ کہ اس کی تعریف کی جاتی ہے۔بایں ہمہ، یہ درست ہے، لیکن لفظ مذہب کا کوئی نہ کوئی مفہوم ہے۔اور اس مفہوم کو جاننا بہتر ہوگا۔

"Religion" (مذہب) کا ماخذ لاطینی لفظ (reli gio) یعنی باندھنا ہے، لفظی حوالے سے بات کریں تو مذہب اتحاد، اور، ہم آہنگی کا قاعدہ ہے۔کوئی بھی اصول جو ہمیں بحیثیت مجموعی باندھتا ہے۔وہ مذہب ہے۔یہ محض عقیدہ نہیں، بلکہ طرز عمل بھی ہے۔صرف یقین کلی ہی نہیں، بلکہ وظائف کی ادائیگی بھی، مذہب میں ساری انسانی شخصیت ملوث ہے۔

ولیم جیمز نے مذہب کو یوں بیان کیا ہے کہ افراد کے اپنے تنہائی میں احساسات ،افعال اور تجربات یہاں تک کہ وہ خود اپنے خیال کے مطابق الوہی چیز کے ساتھ تعلق

کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ ''ہوفوڈنگ''مذہب کو یوں بیان کرتا ہے کہ اقدار کو مضبوط بنانا مذہب ہے۔ ''سکندر کے مطابق'' دیوتا میں یقین مذہب ہے۔ پیٹرک کے خیال میں مذہب ایک نظر نہ آنے والی روحانی نظم کے ساتھ عملی تعلق کا شعور ہے۔ وائیٹ ہیڈ کہتا ہے ''مذہب ایک ایسی چیز کا نظارہ ہے جو موجودہ اشیاء کے گزرتے ہوئے بہاؤ سے پرے، پیچھے اور اندر کھڑی ہے۔'' ڈبلیو، ٹی، ٹیس نے مذہب کی تعریف ناممکن، نا قابل حصول اور نا قابل فہم کے لئے روح کی بھوک کے طور پر کی، کانٹ نے کہا، ''مذہب ارادے کا معاملہ ہے۔'' اسے عملی استدلال کے ساتھ سمجھا اور شناخت کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ مخصوص افعال کرنے چاہییں، یا مخصوص رویے اختیار کیے جائیں، ڈیورانٹ ڈریک نے مذہب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

''دل اور ارادے کی ترتیب جس کے ذریعہ انسان اعلیٰ ترین چیزوں پر غور و فکر تک آیا اور زندگی کے سطحی پہلوؤں تک اور حادثات سے بالاتر اندرونی طمانیت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔'' اس کی اندرونی نوعیت کے اعتبار سے ہم اسے روحانیت کہتے ہیں۔ جب یہ خارجی صورتوں اور بصیرتوں میں مجسم ہوتا ہے تو ہم اسے مذہب کہتے ہیں۔

سوامی دیوکانند کے خیال میں مذہب عقائد، مسلکوں میں ہے۔ نہ ذہنی استدلال میں یہ ہونا اور بن جانا ہے، یہ شعور و فہم ہے۔

چنانچہ موزوں عمل کے ذریعہ زندگی گزارنے کا فن مذہب ہے، یعنی ہم اپنے آپ میں دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی میں اپنی زندگی کیسے گزاریں اور زندگی میں طمانیت اور مسرت کیسے حاصل کریں۔

عقیدے کی تعریف

ہندوستان میں عقیدے کے لئے لفظ ''دھرم'' استعمال ہوتا آیا ہے۔ اس کا تعبیری مفہوم یہ ہے کہ ''جس پر ہر چیز منحصر ہے'' قدیم تہذیب اور فلسفہ میں یہ نظریہ انوکھا اور بے نظیر ہے۔ دھرم سنسکرت لفظ دھر یعنی ''منحصر ہونا'' سے ماخوذ ہے۔ یہ ہر حوالے سے

اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے سب کچھ کو سہارا دینے والا قاعدہ ہے۔

عقیدہ یا دھرم محض مذہب نہیں، جیسا کہ مغرب والے سمجھتے ہیں۔ جدید مفہوم میں دیکھا جائے تو ہندوستانی عقیدہ ہر شہری کا اپنے معاشرے کے تمام ارکان کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ گیتا کے مطابق معاشرے میں ہر فرد کا ایک مخصوص فرض ہے۔

شنکر اچاریہ نے اپنی برہم سوتر بھاشیہ میں دھرم (عقیدے) کی تعریف یوں کی جو دنیا کو استحکام دیتا ہے اور سب چیزوں کو خوشحالی و برکت دیتا ہے۔ وہ دھرم ہے۔ ہندوستانی مکتبہ فکر میما سا کے مطابق ویدک احکام کی بجا آوری دھرم ہے۔ رامائن میں کہا گیا دھرم دنیا میں قادر مطلق ہے اور سچائی کی بنیاد دھرم پر ہے۔

عقیدہ وہ چٹان ہے جس پر تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ یہ تمام فضیلتوں کی اساس اور تمام نیک خیالات کی افادیت ہے۔ بہ الفاظ دیگر عقیدہ ایک ارتقائی، الوہی نظریہ ہے نہ کہ منتشر تصور۔

عقیدہ زندگی کی مختلف سرگرمیوں کو ہم آہنگی اور سمت عطا کرتا ہے۔ یہ ایک اخلاقی یا سماجی اصول نافذ کرنے والا مسلک یا دین نہیں۔ عقیدے کا مقصد انسان کو اس طبعی سطح سے سربلند کرنا اور اعلیٰ تر سطح پر فائل بنانا ہے۔ زندگی کے چار مقاصد اس ''عقیدے'' پر حکمران ہیں یعنی عقیدہ، دولت، جنس اور نجات۔

فلسفہ اور مذہب کے درمیان تعلق

اگرچہ فلسفہ اور مذہب کی وضاحت کے لیے مختلف تعریفیں پیش کی گئی ہیں لیکن بنیادی اعتبار سے یہ باہم متضاد نہیں۔ فلسفہ اور مذہب دو طریقہ کار ہیں جن کے تحت نفس کائنات کو زیر کرتا ہے۔ فلسفہ اور مذہب کچھ حد تک آپس میں مختلف ہی لیکن درحقیقت ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ انجام کار یہ دونوں ہی انسانی اور معاشرتی زندگی کو بلند تر اور لطیف سطح تک پہنچاتے ہیں انسان کو ایک بہتر فلسفہ اور ایک بہتر مذہب کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلسفہ اور مذہب کا صرف ایک مقصد ہے۔ یعنی کثرت میں وحدت کی تلاش۔

فلسفہ میں مطمع نظر سکون‘ ہم آہنگی‘ موزونیت اور نجات ہے۔ چنانچہ فلسفہ اور مذہب اکثر ایک ہی جیسے خیالات پر غور کرتے ہیں۔ جیسے نفس‘ اس کا ماخذ اور مقدر‘ خدا اور تخلیق کائنات ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مواقع پر‘ مذہب اور فلسفہ کا تعلق انتہائی دوستانہ نہیں ہے۔

فلسفہ مذہب

ہماری زبان میں فلسفہ مذہب کی اصطلاح بطور مذہب کا سائنسی مطالعہ استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ مذہبی تجربے کی ایک عقلی اور منطقی تعبیر ہے۔ یہ تمام مذہبی بنیاد پرستی‘ غیر منطقی پن اور توہمات کا تریاق ہے۔ جہاں تک مذہب کے متعلق فلسفیانہ فکر کا تعلق ہے فلسفہ مذہب میں ضم ہے۔ فلسفیانہ فکر ہمیشہ منطقی اور گہرائی میں عقلی ہوتی ہے یہ مذہبی تجربے کا ایک منطقی تجزیہ ہے۔ اس کے تمام مسائل...... خدا‘ عقیدہ‘ عبادت‘ دعا‘ روایت‘ بصیرت‘ اور لافانیت...... مذہبی تجربہ کے فیصلہ کن مراحل ہیں۔ تاہم‘ استعاروں اور تشبیہات کو استعمال کیے بغیر مذہبی تجربہ کو عقل کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب کی صداقت بطور فلسفیانہ تحقیق کے معروض کی صداقت سے بنیادی اعتبار سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ جب ہیگل نے تصورات یا مذہب کو فلسفہ کے خالص عقلی نظریات سے تشبیہ دی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا۔ یعنی اس کے خیال میں صورت مختلف ہے مافیہ نہیں۔

فلسفہ مذہب مذہبی تعلیمات کا ترجمان نہیں۔ مذہبی وظائف‘ رسومات‘ عبادت‘ دعا وغیرہ کو فلسفہ مذہب کے نکتہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ مذہبی تعلیمات کی طرح یہ سب مذہب کے وظائف ہیں۔ لیکن فلسفہ مذہب میں ہم نے مذہب کی ان تمام جزئیات کے فلسفیانہ پہلوؤں کا مشاہدہ کیا ہے۔ نہ صرف خدا پرست بلکہ ملحد‘ لاادری بھی مذہب کے متعلق فلسفیانہ انداز میں سوچ سکتا ہے۔ فلسفہ مذہب بنیادی حوالے سے دینیات کی شاخ‘ مذہبی اعتقاد کا نظریہ نہیں بلکہ فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ تاہم یہ الٰہیات دانوں کے نظریات مفروضات اور دلائل کا مطالعہ کرتی ہے۔

فلسفہ مذہب کی نوعیت اور وسعت

۱۔ فلسفہ مذہب بالعموم منطق اور استدلال سے وابستہ ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ انسان ایک منطقی حیوان ہے اور منطق ہی سے اسے دیگر حیوانوں سے مختلف بناتی ہے۔

۲۔ فلسفہ مذہب دل سے زیادہ دماغ کا معاملہ ہے۔ دل یقین' جذبے اور احساس کا مقام ہے۔ لیکن ذہن علم' فہم اور استدلال کے لیے ہے۔

۳۔ یہ مذہبی مظہر کا منطقی اور استدلالی تجزیہ ہے۔ کوئی منطقی مذہب بنیادی منطق (Infrarational) کی نسبت زیادہ فلسفیانہ ہے یعنی جبلتیں' ہیجان' خام جذبات وغیرہ۔ استدلال مذہب کے توہمات اور اندھے اعتماد کو مسترد کرنے میں ہماری خاصی مدد کرسکتا ہے چنانچہ فلسفہ مذہب کے میدان میں یہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۴۔ فلسفہ مذہب کی بنیاد مذہبی تجربہ پر ہونی چاہیے۔ مذہب کا اعتقاد' احساس اور جذباتی وابستگی اس کے تجربے کو بیان نہیں کرسکتی' کیونکہ مذہب کا باطنی حصہ نا قابل بیان اور نا قابل اظہار ہے۔ مذہبی تجربات' علامات' تشبیہات' اور بصیرتوں کے ذریعہ بیان اور تصدیق کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم مختلف مذاہب کے مذہبی تجربات فلسفہ مذہب کے دائرہ تحقیق میں شامل ہیں۔

۵۔ فلسفہ مذہب چند اہم مذاہب مثلاً ہندومت عیسائیت' بدھ مت' جین مت' اسلام' شنومت' وغیرہ کا احاطہ کرتا ہے۔ اسے قدیم مذاہب فطرت پرستی' روحیت' وغیرہ کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ فلسفہ مذہب کو مختلف مذاہب کا امتزاج ڈھونڈنا ہوگا۔

۶۔ فلسفہ مذہب ہمیشہ فلسفیانہ بنیادوں پر منحصر ہوتا ہے' یعنی ...... انداز حیات' حیثیت' علم اور زندگی کی تخلیق۔

۷۔ فلسفہ مذہب کی بنیادی عینیت (بطور اساسی اصول علم) پر ہے۔ یہ خیالات پر زور دیتا ہے اور کائنات کے روحانی پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔

۸۔ فلسفہ مذہب میں دنیا کے علمی اور وجودیاتی مسائل شامل ہیں۔ یہ مذہبی علم کی

نوعیت کا مشاہدہ اور حقیقت مطلق کی نوعیت کا مطالعہ کرتا ہے۔

۹۔ فلسفہ مذہب خدا' نجات' عبادت' دعا' تخلیق ابدی زندگی' روایات' عقائد جیسے نظریات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ہمیں ان تمام نظریات کے فلسفیانہ پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ہے۔ خدا کے مختلف نظریات اور وجود کے مسائل سے اس کا تعلق فلسفہ مذہب کی وسعت اور مشاہدے کی بنیاد بن جاتا ہے۔

۱۰۔ فلسفہ مذہب میں انسانی اقدار فلسفیانہ تحقیق کا معروض بن جاتی ہیں۔ نوع انسانی کا موزوں مطالعہ انسان ہے۔ اور مذہب کے مطالعہ کو شامل کیے بغیر انسان کا مطالعہ ہرگز مکمل نہیں ہوسکتا۔

۱۱۔ روحانیت فلسفہ مذہب کا محور ہے۔ روحانی بھوک کا جاگنا مذہب کا نقطہ آغاز ہے۔ لیکن اس مافوق الفطرت چیزیں شامل ہیں اور نہ ہی مخصوص خارجی رسومات کی ادائیگی۔ روحانی نجات فلسفہ مذہب کا مقصود ہے۔

۱۲۔ فلسفہ مذہب کا نظریہ انسان کی اندرونی دنیا کی حقیقتوں کی سائنس' فلسفیانہ اور روحانی روایات کا مطالعہ بھی بن جاتا ہے۔ فلسفہ مذہب داخلی تجربے روحانی حقیقتوں کے ساتھ منسلک ہونے کا معاملہ ہے' اعتقادیا مسلک کا معاملہ نہیں۔

۱۳۔ معروضی طور پر بات کی جائے تو فلسفہ مذہب سے مراد وہ روحانی اصول ہیں جن کے ذریعے انسان کاملیت' بصیرت جلوہ خدایا مکتی حاصل کرتا ہے۔ یہ روحانی اصول راست بازی' پاکیزگی' تقویٰ' خود ضبطی' عدم تشدد' نرمی' شفقت' بے غرض عمل' راست گوئی' فرض شناسی' متانت اور خدا سے محبت اور لگاؤ ہے۔

۱۴۔ موضوعی طور پر بات کی جائے تو فلسفہ مذہب سے مراد انسان کی زندگی میں کبھی کبھار کا نہیں بلکہ ہمہ وقت مذہب ہے۔ جب مذہب خون میں بہتا ہے ہماری نبض میں مرتعش ہوتا ہے جب یہ عین ہماری زندگیوں کی سانس بن جاتا ہے تو تب ہمارے لیے سچا بنتا ہے۔

فلسفہ مذہب کا طریقہ کار

فلسفہ مذہب کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں فلسفیانہ طریقہ کار اپنانے پڑیں گے یعنی ......استقراء (Induction(‘ استخراج (Deduction) ‘ تجزیہ اور امتزاج۔

استقراء......مختلف مخصوص مفروضات کے ذریعے ایک عمومی مفروضے تک پہنچنے کا عمل بطور طریقہ استقراء مانا جاتا ہے۔ جسے سائنس دان اکثر استعمال کرت ہیں۔ استقراء کے اس طریقے میں ہم مثالوں کا مشاہدہ اور باری باری ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ استقراء کے اس طریقے میں ہم مثالوں کا مشاہدہ اور باری باری ان کا تجزی کرتے ہیں اور انجام کار ایک مشترک اصول تک پہنچتے ہیں۔ یہ عمل عمومیت کاری (Generalization) کہلاتاہ مثلاً رام ایک مذہبی آدمی ہے۔شاہ ولی اللہ ایک مذہبی آدمی ہے‘چنانچہ تمام آدمی مذہبی ہیں۔ہم یہ طریقہ فلسفہ مذہب پر لاگواور اس کے مسائل حل کرسکتے ہیں۔نتیجہ تک پہنچنے کے لیے بہت سے لوگوں کے مذہبی تجربات کو مدنظر رکھا جاسکتا ہے۔

استخراج......کسی عام مفروضے سے کسی خاص مفروضے تک پہنچنے کا عمل استخراج ہے مثلاً تمام انسان مذہبی ہیں۔گاندھی ایک انسان ہےلہذا گاندھی مذہبی ہے۔یہاں ہم کوئی بھی نظریہ یا قانون لے کر اسے کسی بھی مخصوص کیس پر لاگو کرسکتے ہیں تاکہ مذہبی اور فلسفیانہ مسائل حل کرسکیں۔

تجزیہ......کسی پیچیدہ حقیقت کو جزو جزو کرکے دیکھنا تجزیہ ہے۔ یہ ایک مخصوص تجربے کی حالت میں شامل مختلف عناصر کے درمیان امتیاز کا عمل ہے تاکہ وہ زیادہ صحیح ہو جائیں۔

امتزاج......یہ عمل بکھرے ہوئے مختلف عناصر کو ایک مخصوص تجربے میں اکٹھا کرنا ہے جو نئے نقوش اور حقیقتوں کو روشنی میں لاتا ہے۔عینیت پسند فلسفیوں نے امتزاج پر

زور دیا۔ ہیگل نے اپنی جدلیاتی عینیت میں نشاندھی کی تھی کہ دعویٰ (Thesis) اور ضد دعویٰ (Anti Thesis) کے درمیان جد و جہد ہوتی ہے اور نتیجتاً ایک نیا دعویٰ ظاہر ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ جب تک خیال قطعی کاملیت حاصل نہ کر لے

فلسفہ مذہب کا مقصد

فلسفہ مذہب کا مقصد مذہب کے لیے ایک اہم خدمت سرانجام دینا' مذہبی عقیدہ کا تجزیہ اور اسے صقیل کرنا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ عقیدے کے بنیادی عناصر کو حادثاتی اور ثانوی عناصر سے الگ کرتا 'توہمات اور خام عصبیت کے ملغوبے میں سے دائمی قدر کی اور سچی چیزیں نکالتا اور اخدا' انسان اور کائنات کا حقیقی نظریہ تشکیل دیتا ہے۔ یہ مذہبی عقیدے اور تعیمات کو منطقی بصیرت میں منتقل کرتا ہے اور انسان کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ صداقت' نیکی اور خوبصورتی سے بھرپور زندگی گزارے۔

فلسفہ مذہب کا مرکزی مقصد مذہبی شعور کی حقیقی نوعیت جانچنا اور ایک اچھی زندگی کی خواہش کرنا ہے۔ فلسفہ مذہب ایک منطقی مطالعہ ہے جو ہستی کے مفہوم واضح اور مقصد حیات کا تعین کرتا ہے۔ اس کی بنیاد کوئی عقلی کسرت نہیں بلکہ کائناتی حرکت کی تہہ میں موجود صداقت کا تر و تازہ' قابل تصدیق تجربہ ہے۔ مذہب زندگی کا معیار بہتر بنانے میں اپنے کردار کے ذریعہ اپنی حقیقی قدر متعین کرتا ہے۔ فلسفہ مذہب کا تعلق زندگی سے جوڑنا اور اس کے عملی تائج کو عملی طور پر آزمانا چاہیے۔ انسان کے ارتقاء میں اس کا ایک امدادی کردار ہے۔

سوامی ویوکانند کے مطابق اگر صرف ایک عالم گیر مذہب اور تمام مذاہب میں صرف ایک ہمہ گیر صداقت کا موجود ہے تو وہ خدا کو پانا ہے۔

فلسفہ مذہب محض ایک تجریدی تصور یا نظریہ نہیں۔ اس میں جتنا نظریہ ہے اتنا ہی عمل بھی۔ فلسفہ مذہب کا مقصد مذہب یا فلسفہ کی کسی صورت حال کی توجیہ کرنا نہیں بلکہ انسانی

اقدار، خود آ گہی اور (اس کے ذریعے) خود حقیقت کو فروغ دینا ہے۔

مذہب کا مقصد دوہرا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے ہے اور دوسرے انسان کی روحانی زندگی سے بھی ...... یعنی اسے مکتی پانے کے لیے تیار کرنا سماجی حوالے سے مذہب انسانی طرز عمل کو باضبط بناتا اور افراد کے کردار کو موزوں قسم کے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ جب مذہب پر عمل درآمد کیا جائے تو یہ انسان اور معاشرے پر صحت، دولت اور مسرت نچھاور کرتا ہے۔ نتیجتاً ترقی اور خوشحالی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے بدن کی سانس کے مانند مذہب بھی معاشرے کی قوت حیات ہے۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

۲ :: مذہب کا تاریخی ارتقاء

مذہب کی تاریخ سے موزوں طور پر آگاہ ہوئے بغیر ہم اس کے متعلق فلسفیانہ حوالے سے بحث نہیں کر سکتے۔ ہمیں نوع انسانی کی مکمل مذہبی ترقی کے تمام مراحل اور ادوار تہذیب میں تجزیہ کرنا ہوگا۔

دراوڑی میراث (۳۰۰۰ تا ۲۰۰۰ صدی قبل مسیح)

دراوڑیوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن میں کچھ حصہ ڈالا۔ موجودہ ہندو مذہب میں ان اثرات کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ موہنجوداڑو سے کچھ مہروں کی دریافت اور ہڑپہ سے ملنے والے چھوٹے چھوٹے مجسمے پتھر کی شبیہیں وغیرہ مذہبی اعتقادات' وظائف وغیرہ کا ثبوت ہیں۔ مقدس ماں کا مسلک وادی سندھ کی تہذیب کے دور میں وسیع پیمانے پر مقبول تھا۔ لوگ نسوانی قوت میں تمام تخلیق کے سرچشمے کے طور پر یقین رکھتے تھے۔ الوہیت کی کسی شبیہ یا علامت کی پرستش کی تقریب میں دیوتاؤں کو پھولوں' پھلوں' پانی کی بھینٹیں' دیوی دیوتاؤں کی شیر' بیل' درخت' پہاڑ وغیرہ جیسی علامتیں دراوڑی میراث کی مہر توثیق ہیں۔ تنتر اور منتر میں یقین بھی دراوڑی میراث مانا جاتا ہے۔ سمتھ کا کہنا ہے کہ بالاصل دراوڑیوں کے درمیان پوجے جانے والے ''شیطان'' براہمنوں نے اپنا لیے۔ انہوں نے انہیں نام دیے اور بنیاد پرست ہندو دیوی دیوتاؤں کے ساتھ شناخت کیا۔ دراوڑیوں کے درمیان دیوتاؤں' ہیروز کی مقبول اساطیر نے آریائی اثر قبول کیا اور کچھ ترامیم اور بہتریوں کے ساتھ پرانوں میں دیوتاؤں' بادشاہوں اور اولیاء کی حکایات اور داستانوں میں جذب ہو گئیں۔ آریوں کے ہندوستان میں ورود سے کافی پہلے ہی یہاں شیولنگ کی پوجا خاصی مقبول تھی۔ ان کی مذہبی ثقافت کے کچھ نقوش ان کی شبیہوں میں باقی ہیں جن میں ماتا دیوی' شکتی اور لنگ (جسے شیوخیال کیا جاتا ہے) شامل ہیں۔ عظیم رزمیہ نظمیں مہابھارت اور رامائن شیو کی شان وشوکت کی حمد گاتی ہیں۔

روحیت

انسانی اور علامتی صورتوں میں شیو اور شکتی اور اوتار دیوتاؤں کی پرستش کے علاوہ لوگ روحیت کے پیروکار بھی تھے۔ روحیت (Animism) سے مراد اس یقین کے ساتھ پتھروں، درختوں اور جانوروں کی پوجا کرنا ہے۔ کہ یہ اچھی یا بری روح کے مسکن ہیں۔ جانوروں کی پوجا ان کے مذہبی عقیدے کا ایک حصہ تھی اور اس کا اشارہ ہاتھی، شیر، بیل گائے جیسے جانوروں کی مہروں اور تعویذوں پر بنی تصاویر، پکی مٹی کے ظروف اور پتھر کی شبیہوں سے ملتا ہے۔ دنیا میں آریائی لوگوں نے سورج کی پوجا کی ہے اور دراوڑی لوگ ہواؤں بارشوں آگ اور مٹی کے ناظم دیوتاؤں کے معتقد رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آج بھی ہندو پہاڑ کی چوٹیوں، برگد اور پیپل جیسے درختوں، تلسی جیسے پودوں اور گنگا، گوداوری و نرمدا وغیرہ دریاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔

موہنجوداڑو سے دریافت شدہ مخصوص مہریں انسانی اور حیوانی قربانی کا پیش کرتی ہیں۔ گائے، بکری، بھیڑ وغیرہ جانوروں کی قربانی اور انسانی قربانی بھی قدیم نسلوں اور ہندوؤں میں عام رہی ہے۔ ای بی ٹیلر کے مطابق دنیا کے اسی مظاہر پرستانہ نظریہ کی بنیادوں پر مذہب کی عمارت ابھری۔

کچھ لوگ روحیت یا مظاہر پرستی کو بلا سوچے سمجھے مابعدیاتی مذہب کہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایک قسم کا مابعدیاتی فلسفہ ہے۔ ہولڈنگ کے خیال میں یہ ''انتہائی ابتدائی انسانی فلسفہ ہے''۔ ٹیلر کی نظر میں ''روحیت مذہب نہیں بلکہ مذہب کی بنیاد ہے فلسفہ مذہب کی ایک قسم ہے''

فلسفہ کی قسم کے طور پر روحیت حتماً قدیمی نہیں۔ اس میں روح 'لافانیت' دوبارہ جنم' اول عمل وغیرہ شامل ہیں۔ قبائلی انسان کو یقین تھا کہ جسم کے مرنے پر روح فنا نہیں ہوتی۔ بیشتر ہندوستانی قبائل کا عیدہ ہے کہ موت کے بعد انسان کی روح جسم میں سے نکل کر کسی جانور، پرندے یا دیگر وجودوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

ٹوٹم ازم

ٹوٹم ازم سے مراد ایسا نظام ہے جس میں کوئی شخص یا ایک معاشرتی گروہ کسی جانور یا پودے یا غیر جاندار شے اور ان اشیاء سے منسلک عقائد اور رسومات کے ساتھ خصوصی تعلق میں شناخت کیا جاتا ہو۔ جانور یا پودے یا کہیں کہیں بے جان اشیاء کی انواع ٹوٹم ہے۔ یہ دیوتا تو نہیں لیکن اس کا ہم اصل ارو قابل تعظیم ہے۔ مختلف قبائل مختلف ٹوٹموں پر یقین رکھتے ہیں۔ درخیم (Durkheim) اسے انتہائی سادہ اور قدیم مذہب کہتا ہے۔

ٹوٹم ازم کی قدامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کی ہمہ گیریت قابل توثیق نہیں ٹوٹم ازم قبائل کا ہمہ گیر مذہب نہیں۔ دنیا کے بہت بڑے حصے ایسے ہیں جہاں ٹوٹم ازم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ٹوٹموں میں قبائل کی چند ایک روایات جذبہ اور فکر شامل ہیں۔ چنانچہ ٹھوس نداز میں اسے مذہب نہیں کہنا چاہیے۔

ویدک مذہب

آریوں کی تہذیب اور بالخصوص ان کی فلسفیانہ سوچ اور پہلے ہزار سال کے دوران مذہبی وظائف ہمیں ان کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں جنہیں بحیثیت مجموعی ''وید'' کہا جاتا ہے۔ ویدوں کو علم کا حقیقی مخزن خیال کیا جاتا ہے۔ قدیم عقیدے کی رو سے وید الافانی غیر تخلیق شدہ اور بے ازل ہیں۔

ویدوں کے دو بڑے حصے ہیں۔ پہلا حصہ منتر یا سمتھا اور دوسرا برہمن کہلاتا ہے۔ بار بار پڑھی جانے والی عبارت منتر ہے اور ''سمتھا'' کا مطلب ہے اکٹھا کیا ہوا۔ برہمن صرف عبادات اور بھینٹ کی رسم سے متعلقہ رسومات پر ہی زور دیتے ہیں۔ ان کے تین حصے ہیں: (۱) برہمن (۲) آرنیک اور (۳) پریشاد۔

ویدوں کی تعداد چار ہے...... رگ وید' سام وید' یجروید' اوراتھرووید۔ رگ وید سب سے پرانا ہے اور ہمیں دکھاتا ہے کہ فلسفیانہ' سوچ' مذہب' تصورات اور دیگر متعلقہ احساسات وجذبات نے ذہن سنانی میں کیسے جنم لیا۔ سام وید بھجنوں کی کتاب ہے۔

اسے علیحدہ کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے کافی سارے بھجن رگ وید سے مستعار لیے گئے ہیں۔ یجر وید قربانی کے وقت ورد کیے جانے والے منتروں پر مشتمل ہے۔ اس وید کی دو صورتیں شکلہ یجر وید اور کرشن یجر وید ہیں۔ چوتھے وید اتھر وید میں انسانی حقیقی زندگی سے متعلقہ بنیادی امور شامل ہیں۔ اس کی نثر اور نظموں میں خدا کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کچھ نظمیں اہمیت کی حامل ہیں۔

خدا

ویدوں میں بہت سے دیوتا ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ''خدائے مطلق'' نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی ایک بھی دوسروں پر فوقیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی اہم ہے کہ جب کسی دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے تو اسے ''خدائے واحد'' اور خدائے مطلق کے طور پر بیان کیا جاتا۔ میکس مولر نے ''ایک خدا'' کے عقیدے کے لیے (Herotheism) کی یونانی اصطلاح استعمال کی جو کافی مشہور ہوئی۔ خدا کو مختلف ناموں اور مختلف اوصاف اور اختیارات اور مختلف وظائف کے حامل کے طور پر پوجا جاتا تھا۔

ویدک دور میں ہمارے پاس اہم دیوتا یہ تھے: اندرا' اگنی' سوریا' متھرا' ورونا' رودر' اوشا' سرسوتی۔ آج ہندو لوگ وشنو' شیو' کالی' لکشمی اور دیگر دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں۔

زندگی اور اخروی زندگی

دیوتاؤں کی رحمت سے انسان نے دنیا میں طویل اور مسرور زندگی گزاری ہے۔ دیوتاؤں کو سونے مویشیوں بیٹوں اور پوتوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ اس دنیا کو ایسی جگہ تصور کیا جاتا تھا جہاں کوئی شخص دیوتاؤں کی خوشنودی کے ذریعہ مسرت حاصل کر سکتا تھا۔ فراوانی اور عیش موجود تھا۔ موت کے بعد انسان اگلی دنیا میں چلا جاتا تھا جہاں بچھڑے ہوئے آباؤ اجداد تھے۔ یہ اگلی دنیا اعلیٰ تر مسرت والی جگہ تھی۔ ویدک آریائی

انتقال روح پر یقین رکھتے تھے۔

انسان روح اور جسم پر مشتمل ہے۔ وید انسان کے کسی ورمقدر مثلاً جہنم کا ذکر نہں کرتے۔ مرحوم کی روحوں کے لیے دو راہیں ہیں۔ ایک دیوتاؤں کی راہ اور دوسری مرحوم روحوں کی راہ۔ صرف ''عمل'' (کرما) ہی اخروی زندگی کا تعین کرتا ہے۔

عمل اور علم

رگ وید کا بطور مطالعہ منکشف کرتا ہے کہ انتہائی قدیم ادوار میں بھی عمل اور علم کو انسان کی روحانی نشوونما میں دو جدا عوامل تسلیم کیا جاتا تھا۔ عمل کا تعلق اس دنیا سے براہ راست ہے جس میں ہم رہتے ہیں اور علم کا تعلق آگے کی دنیا سے ہے۔ ویدوں کو سرچشمہ علم سمجھا جاتا ہے۔ علم کے ذریعہ ہی روح ابدی مسرت کی حالت پا سکتی ہے۔

اپنشد

اپنشد مختلف ادوار کے متعدد مصنفوں کے تحریر کردہ ہیں۔ وہ فلسفہ کا ایک باربطہ یا باقاعدہ نظام پیش نہیں کرتے۔ یہ روحانی گروؤں کے اقوال پر مشتمل ہیں۔ جنہوں نے شدید مراقبے کے ذریعہ اعلیٰ ترین سچائی کی جھلک دیکھی۔ ان کا طریقہ کار منطق کی بجائے تاکیدی ہے' اور اصل مقصد خدا انسان اور اردگرد کی دنیا کے متعلق مطلق علم حاصل کرنے کے لیے ذہن انسانی کی فطری خواہشات کو تسکین دینا۔

اپنشدوں نے ہندوستانی فکر و فلسفہ پر کافی اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہندوستان کے تمام فلسفیانہ نظام اور مذاہب اپنشدوں سے پھوٹے۔ ہندوستانی فلسفہ کے چھ نظام بحیثیت مجموعی اپنشدوں کی توسیع ہیں۔

تاہم نظام ویدانت اپنشدوں کے پیغام کا خصوصی اور خود تکمیلی مظہر ہے۔ دیگر نظاموں میں سے پورو میمامسا زمانی اعتبار سے اولیت کا حامل ہونے کے ساتھ ویدانت سے قریب ترین ہے۔ اہم اپنشد لازماً ہندوستانی فلسفیانہ نظاموں کے ظہور سے پہلے ہی موجود رہے ہوں گے۔ تمام موجودات کی روحانی یگانگت اپنشدوں کا بنیادی

موضوع ہے۔یہ کل کائنات میں ایک قادر مطلق' ہر جگہ موجود حقیقت کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

اپنشدویدوں کا روحانی علم ہیں جو مرکزی طور پر مندرجہ ذیل نظریہ ہائے تخلیق واضح کرتے ہیں:

۱۔ مادہ خدا سے الگ وجود رکھتا ہے

۲۔ خدا نے عدم سے کائنات تخلیق کی اور وہی اسے چلاتا ہے۔

۳۔ خدا اور دنیا ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

۴۔ صرف خدا ہی حقیقی ہے۔

طویل اور رزمیہ نظمیں

مہابھارت' رامائن اور بھگوت گیتا دنیا کی ادبی اور مذہبی فلسفیانہ تاریخ میں بے نظیر اہمیت کی حامل ہیں۔فلسفہ کے مختلف نظام یعنی' سانکھیہ' یوگا' ویدانت' شیوا' شکتا' وغیرہ سب ان طویل رزمیہ نظموں میں بیان کیے گئے ہیں۔

مہابھارت...... اس میں پورے کے پورے ابواب مذہب' فلسفہ اور ادب پر مشتمل ہیں۔ذرائع علم کے حوالے سے مہابھارت ویدک صحائف کی حاکمیت تسلیم کرتی ہے۔ اس میں متعدد مذہبی اور فلسفیانہ فرقوں کا ذکر بھی ملتاہ۔مہابھارت تکوینیات کے بارے میں مختلف نظریات پر گہرا غور وفکر کرتی ہے۔

رامائن......رام کی کہانی رامائن نے ہندوستانی تہذیب کو زندگی دی اور ہماری قوت حیات کو حتمی مقصد' یعنی حصول صداقت کی جانب متعین کیا۔اس رزمیہ میں رام ہر اچھی اور نیک چیز کی تجسیم ہے۔ساری دنیا کی نیکی کا مظہر' اس کا انداز نہایت سادہ اور پر جلال ہے ساری نظم میں محبت جرات اور بہادری اور تقویٰ کو بڑے اعلیٰ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ایک ادبی تصنیف کی حیثیت میں رامائن دو ممتاز ادبی پہلو رکھتی ہے......حقیقت پسندانہ اور رومانوی' کردار بالعموم انسانی' مافوق الانسانی اور نیم انسانی ہیں۔رامائن میں

نرم روی' نظام کاری' جنگ اور ہماری زندگی کے کچھ دیگر معاشرتی پہلوؤں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ہم رامائن میں مذہب' اخلاقیات فلسفہ' سیاست' تاریخ سماجیات اور معاشیات جیسے موضوعات کو بھی دیکھتے ہیں۔ایک شاندار شاعرانہ فن اور تاریخ کا نمونہ ہونے کے علاوہ رامائن ایک درھم شاستر بھی ہے..... راست بازی کی تعلیم دینے والی مقدس کتاب۔

رامائن مختلف کرداروں کی طاقت اور کمزوری کو سامنے لاتی ہے۔رام آریائی زندگی کے اعلیٰ تصورات کی تجسیم ہے۔وہ ایک قابل اعتماد اور فرض شناس بیٹا شفیق بھائی محبت کرنے والا خاوند سخت گیر اور سنگدل جنگجو اور ایک مثالی بادشاہ بھی ہے لکشمن اور بھرت مثالی بھائیوں کے نمائندہ ہیں' جبکہ سیتا باوفا بیوی کی دیرتھ میں نسوانی حسن کے لے مردانہ کمزوری دکھائی گئی۔جس کی وجہ سے نہ صرف وہ خود بلکہ اس کی ساری بادشاہت بھی برباد ہوئی۔

بھگوت گیتا..... بھگوت گیتا مرکزی طور پر فلسفہ کے حقیقی قواعد سکھاتی ہے۔عمل' بھگتی' علم' گیتا کے مطابق جس طرح جاہل لوگ اپنی غرض کے لیے عمل کرتے ہیں اسی طرح عارف لوگ بے لوث ہو کر سنسار کے آنند اور اطمینان کی خاطر عمل کرتے ہیں۔ جاہل کا عمل بندھن کا باعث ہوتا ہے مگر گیانی کا عمل نجات دلاتا ہے۔صلہ کی امید رکھے بغیر پیہم عمل کرنا بھگوت گیتا کی بنیادی تعلیم ہے۔یعنی عمل کا مقصد اپنی غرض پورا کرنا نہیں بلکہ دوسروں کی خدمت کرنا چاہیے۔

بھگتی محبت اور وابستگی کی راہ ہے۔اس کے مطابق تمام مذاہب کا حتمی مقصد محبت کے ذریعہ پایا جاسکتا ہے۔محبت تخلیقی قوت ہے۔اور تخلیق کے ذریعہ ہم مسرت اور لافانیت تلاش کرت ہیں۔خدا سے لازوال اور اعلیٰ ترین محبت کر کے ہم نجات پاسکتے ہیں۔

علم کی راہ ''خود آگہی'' پر مرکوز کرنے کی تاکید کرتی ہے۔خود کو جاننا برہما کو جاننا

اروا س میں سما جاتا ہے۔ اس علم سے بڑھ کر کوئی چیز طاقت ور نہیں۔ جیسے آگ کا شعلہ ایندھن کو راکھ کر دیتا ہے' اسی طرح علم کی آگ اعمال کو راکھ کر دیتی ہے۔ علم حاصل کر لینے کے بعد طمانیت ملتی ہے۔

گیتا کی بنیادی اور مابعد الطبیعیاتی تعلیم یہ ہے کہ غیر حقیقی میں سے کچھ بھی وجود میں نہیں آیا اور حقیقی میں سے وجود میں آنے والا کچھ بھی نابود نہیں ہوتا۔ روح (آتما) غیر فانی' ہر جگہ موجود' غیر متحرک' قدیم باطنی ناقابل فکر اور غیر منقلب ہے۔ صرف جسم تباہ ہوتے ہیں روح نہیں۔ یہ پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ یہ لافانی اور پائیدار ہے۔ جنم مرن سے آزاد ہونے کے باعث یہ جسم کے ساتھ فنا نہیں ہو سکتی۔ جیسے کوئی شخص گندے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ایسی طرح روح ایک جسم سے نکل کر نئے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔

مذہب کی زمرہ بندی

اگر چہ مذہب کو متعدد انداز میں زمرہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مذہب کی تاریخی ترقی کے مطابق اسے مندرجہ ذیل میں تقسیم کرنا موزوں ہوگا:

(۱) قبائلی (۲) قومی اور (۳) عالم گیر مذہب

قبائلی مذہب

قبائلی مذہب انسانی تہذیب میں مذہب کی ابتدائی ترین صورت ہے۔ قبائلی معاشرہ تعلیم یافتہ اور مذہب نہیں ہوتا۔ کچھ محققین کی رائے ہے کہ قبیلے زمین کے اصل باشندے ہیں۔ کول' بھیل' گونڈ' اور سنتھال ان مختلف قبیلوں کے نام ہیں جو بالخصوص ہندوستان میں رہتے ہیں۔

وہ چھوٹی قد و قامت' چھوٹی چڑھی ہوئی ناک گہری رنگت گھنے والوں اور نمایاں رخساری ہڈیوں کے ساتھ چپٹے چہرے والے ہیں۔ ان کا تعلق تبتی' چینی' جاپانی اور برمی لوگوں والی نسل ہی سے ہے۔

ان کی تہذیب اور مذہب ان کے وجود کی صرف مادی سطح پر ہی ہے۔اس سطح پر ان کا مفاد صرف زندہ رہنے' خوراک کی تلاش قدرتی آفات اور دشمنوں کے حملوں کے خلاف اپنے دفاع تک محدود ہے۔ چنانچہ غیر مذہب انسانی مادی خواہشات سے بلند تر نہ ہوا اور اس کا مذہب بھی اس سے کم تر ہی رہا۔قبائلی لوگ بلند پہاڑوں' سیلابی دریاؤں بڑے درختوں اور قدرتی چیزوں کے پیچھے مافوق الفطرت طاقتوں کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں۔ مذہب کی تاریخ ترقی کا آغاز باطنی قوت والے لشکر ارواح پر اعتقاد کے ساتھ ہوا' جسے مخصوص رسومات کی ادائیگی سے متاثر کیا جاسکتا ہے۔

قبائلی لوگ صرف ان قوتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ جو انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی ہوں۔متعدد قبائل میں خدائے مطلق کو بیشتر سورتوں میں سورج یا چاند کے ساتھ شناخت کیا جاتا ہے۔تصور خدا ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں مختلف ہے۔ ہر قبیلے کا اپنا مقامی دیوتا ہے۔دیہی دیویوں اور مقامی دیوتاؤں کے متعلق بہت سی داستانیں اور قصے مقامی لوگوں اور امیدوں اور خواہشات' ابتلاء و آزمائش اور حقوق و فرائض میں رچے بسے ہیں' چاہے وہ قبائلی ہوں یا غیر قبائلی۔مقامی دیوتاؤں کی تعظیم میں کچھ میلے اور جشن منعقد ہوتے ہیں جن میں تمام قبائل شرکت کرتے ہیں۔

قومی مذہب

قبائلی مذہب کا بنیادی تعلق متعدد روحوں کی عبادت سے ہے جنہیں دیوتاؤں کے ناموں کے ساتھ منسوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی کوئی ذاتی تاریخ یا ذاتی کردار یا ذاتی نام نہیں۔ کثرت پرستی کی تبدیلی اس عمل پر منحصر ہے جس کے تحت فطرت...... روحیں...... آہستہ آہستہ مجسم ہو گئیں۔

قومی مذہب کی نشوونما میں دو واضح رجحان نظر آتے ہیں (۱) خداؤں کی تہذیب اخلاق (۲) وحدانیت کی سمت میں پیش قدمی۔ان دو تحریکوں نے عالم گیر مذہب کی راہ ہموار کی اخلاقی صفات مثلاً پاکیزگی راست بازی' بھگتی' قبائلی ذہن سے وابستہ نہیں

ہیں۔قومی مذہب میں ہماری زندگی کے اخلاق نظم وضبط اور دیوتاؤں پر زور دیا گیا۔ اخلاقی کردار کو مذہب کے مختلف دیوتاؤں سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔مخصوص اچھائیاں مخصوص دیوتاؤں سے منسلک ہیں۔مثلاً اندرا شجاعت ورونا عدل اوراخلاقی قانون کے نمائندہ ہیں اس کے علاوہ ہندو تثلیث کے تین دیوتا کائناتی منڈپ میں تین صفات تخلیق' استواری اور تباہی سے تعلق رکھتے ہیں۔وشنو ہستی اور اسے قائم رہنے کا شیو تباہی اور بربادی۔جبکہ برہما ان دونوں کی درمیانی خصوصیت کا دیوتا ہے۔

اگرچہ خارجی اعتبار سے ہنومت کثرت پرست لگتا ہے کیونکہ ہندو لوگ وشنو شیو شکتی اور گنیش وغیرہ کی پوجا کرتے ہیں۔لیکندرحقیقت دیوتاؤں اور روحوں کی کثرت میں وحدانیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔جس کی بنیادخدا کی حاکمیت اعلیٰ پر ہے۔چنانچہ مذہبی نکتہ نظر سے ہندومت وحت پرست ہ۔ہندووحدت پرتی مختلف دیوی دیوتاؤں کو مسترد نہیں بلکہ واحد خدا کے اوتار کی حیثیت سے اپنے اندر شامل کرتی ہے اسی طرح عیسائیت بدھ مت' جین مت اور اسلام اپنی فطرت میں سب وحدت پرست ہیں۔عبادت' قربانی عقیدہ' بھگتی' اور دعا مختلف قومی مذاہب میں مشترک ہیں۔

عالم گیر مذہب

تمام مذاہب عالم یعنی ہندومت' جین مت' بدھ مت' عیسائیت اسلام وغیرہ ایک اساسی اتحاد رکھتے ہیں جو ہر مذہب کی جڑ ہے۔کثرت میں وحدت تخلیق کالائحہ عمل ہے۔ ساری کائنات کثرت میں وحدت کا پرشکوہ جلوہ ہے۔ایک مذہب دوسرے مذہب سے مختلف تو ہوسکتا ہے۔لیکن پس منظر میں اتحاد و یگانگت موجود ہے۔ہم بیک وقت انفرادی بھی ہیں اور ہمہ گیر بھی۔کائنات میں مادہ' ذہن اور روح سب ایک ہیں۔ حقیقت میں یہ اتحاد کبھی نہیں ٹوٹا۔

مختلف مذاہب کے مختلف نام ہیں۔ہر مذہب کی بنیاد میں ایک اساسی اتحاد موجود ہے ہمہ گیر اتحاد کا مفہوم مندرجہ ذیل نکات میں واضح کیا جاسکتا ہے۔

(۱)دنیا کا ہر مذہب خدا کا وجود تسلیم کرتا ہے۔

(۲) ہر مذہب یقین رکھتا ہے کہ مذہب انسان کے لیے لازمی ہے۔

(۳) ہر مذہب سچا ہے۔

(۴) ہر مذہب بھگتی خود ضبطی ایثار ذات اور خود آگہی پر زور دیتا ہے۔

(۵)ہر مذہب میں عبادت' دعا' قربانی اور بھگتی موجود ہے۔

(۶) ہر مذہب اعلیٰ تر اخلاق' مہذب کردار' بردباری' تقویٰ' پاکیزگی' اور عالم گیر بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔

(۷) تمام مذاہب' امن اتحاد' شفقت' بہبود اور انسانیت کے مبلغ ہیں۔

(۸) مذاہب اپنی فطرت میں جبلی ہیں۔ وہ انسانوں میں فضائل اخلاق اور اخلاقی اقدار پیدا کرتے ہیں۔

(۹) مختلف مذاہب کے روحانی اصولوں میں اخلقی اقدار' یعنی راست بازی' عدم تشدد' صبر و تحمل' بے لوثی' متانت فرض شناسی محبت' ہمت اور روحانی بصیرت واضح نظر آتی ہے۔

(۱۰) پوری کائنات میں سچے مذہب سے زیادہ انسان کا کوئی اور سچا دوست نہیں۔ مذہب صرف ایک زندگی کا رفیق نہیں بلکہ یہ ہمارا ابدی دوست ہے۔ حیات بعد از موت۔

تمام مذہبی مفکرین اور خدا کے بندوں مثلاً عیسیٰ' حضرت محمدؐ' بدھ' مہاویر' نانک' اور زردشت نے مذہب کی جانب ایک ترکیبی رویہ اختیار کیا۔

نتیجہ بحث

مذہب کی تاریخی ترقی کے حوالے سے ابھی تک ہم نے صرف اس کے مشرقی پہلوؤں پر غور کیا ہے۔ اسے ترجیح دینے کی وجہ اس کا نسل انسانی جتنا ہی قدیم ہونا ہے۔ جس طرح تہذیب وحشیانہ حالت سے ثقافت کی اعلیٰ تر سطح کی جانب درجہ بدرجہ ترقی کا

نتیجہ ہے بالکل اسی طرح مذہب بھی تہذیب کے جزو لاینفک حصوں میں سے ایک ہے اور آہستہ آہستہ کمتر سے اعلیٰ تر سطح تک ترقی کرسکتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک کوئی بھی بالکل نیا مذہب نہیں آیا۔ ہم تاریخ انسانی میں جتنا آگے تک جائیں ہمیں مذہب کی بنیادیں اور عناصر موجود نظر آئیں گے تاہم عظیم عالمی عقائد مشرق کی دین ہیں ماسوائے عیسائیت کے۔

عالم گیر مذاہب میں سب سے کم عمر مذہب اسلام ہے جس کی بنیاد حضرت محمدؐ نے تقریباً ۵۷۰ ہجری میں رکھی۔ عرب ممالک نے اس مذہب کو قبول کیا۔ کتاب کے دوسرے حصے میں دنیا کے تمام اہم مذاہب پر جامع بحث پیش کی جائے گی۔

☆☆☆

۳ :: مذہب اور دیگر اہم اصل موضوعات

''مذہب جذبات سے مزین اخلاقیات کے سوا کچھ نہیں''

(میتھیو آرنلڈ)

مذہب اور اخلاقیات

مذہب اور اخلاقیات دونوں بلند تر ذاتی اور ساجی بہتری کی خاطر ایک مخصوص معاشرتی دائرہ کار میں طرز عمل کے قوانین متشکل کرتے ہیں۔ اخلاقیات کا مطلب انسانی روایات یا عادات کی سائنس ہے۔ یہ اعلیٰ ترین نیکی کی سائنس ہے۔

سوامی ویوکانند کے مطابق ''تمام اخلاقی تعلیم کو مثبت اور منفی عناصر میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ یا تو کہتی ہے ''اسے پیار کرو'' یا پھر ''اسے نہ کرو'' کی منع کرتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد کسی مخصوص خواہش کو دبانا ہے جو انسان کو غلام بنا دے گی۔ جب یہ کہتی ہے کہ کرو تو اصل مقصد آزادی کی راہ دکھانا ہے اور انسانی دل پر قابض پستی کو ختم کرنا ہے''۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ مذہب اور اخلاقیات میں جہاں تک فطرت اور اصولوں کا تعلق ہے مخصوص امتیازات موجود ہیں۔ تاہم مذہب کو بنیاد پرست اور غیر منطقی جبکہ اخلاقیات کو ترقی پسند اور منطقی قرار دے کر ہمیں ان دونوں میں فرق نہیں کرنا چاہیے

میتھیو آرنلڈ کے خیال میں ''مذہب جذبات سے مزین اخلاقیات کے سوا کچھ نہیں'' یہ نکتہ نظر کسی بھی طرح مذہب اور اخلاقیات کے مابین تمیز نہیں کرتا۔ کانٹ کے مطابق مذہب کی بنیاد اخلاقیات پر ہے' اور خدا کی موجودگی اخلاقیات کی موجودگی کے باعث ہے۔

مذہب اخلاقیات کی مثالی بنیاد ہے۔ مذہبی انسان بڑی آسانی سے اخلاق اور اخلاقی انسان بڑی آسانی سے مذہبی بن سکتا ہے۔ مذہب اور اخلاقیات انسانی شخصیت کی ترقی میں اہم شراکت داریاں کرتے ہیں۔ اخلاقیات مذہب پر عمل کر کے اسے

خالص اور صیقل کرتی ہے۔ مذہب اخلاقیات ر ردعمل سے اسے تحریک دیتا ہے۔ اخلاقیات مذہب کی جگہ لے سکتی ہے۔ نہ مذہب اخلاقیات کی۔ فرد کی مکمل اور مستحکم نشونما کے لیی مذہب اور اخلاقیات دونوں ہی ناگریز ہیں۔

عظیم اور قدیم یوگا کے گرو پتنجلی نے انسانوں کے اخلاقی اصول پر زور دیا جو پانچ نیکیوں پر منحصر ہے عدم تشدد' راست بازی' پاک دامنی' چوری نہ کرنا' اور تحفے وصول نہ کرنا۔

مذہب اور اخلاقیات خود زندگی سے نمودار ہوئے اور سچائی' خوبصورتی اور اچھی زندگی کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مذہب اور زبان

معاصر مطالعہ فلسفہ مذہب میں زبان کے مذہبی استعمالات ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کے علاوہ زبان بھی نوع انسانی کی توجہ کا مرکز بنی۔ ہم زبان کے ذریعہ سے اپنے جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ مذہبی تجربات کے معاملہ میں ہمارا اظہار کافی نہیں۔ مذہب کو زندگی کو موضوعی تخمینہ کار کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی زبان اپنے احساسات ساتھیوں تک پہنچانے میں ناکام رہتی ہے۔ یہ ابلاغ کا ایک ناکافی بلکہ مسخ کرنے والا وسیلہ ہے۔ کبھی کبھار دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہبی زبان بے معنی ہے۔ مذہبی معتقدین کو مذہبی عقائد کا مفہوم واضح کرنے کے لیے بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مذہب کا تصور تشکیل دینا مشکل ہے۔ مذہب میں کوئی قطعی اور واضح نظریت دستیاب نہیں بلکہ ہر نظریہ مختلف معانی اور تعبیروں کا حامل ہے۔ نظریاتی تشکیل کا مسئلہ توثیق کے مسئلے سے منسلک ہے۔ جبکہ آپ کسی بیان کی صداقت کی توثیق بھی کر سکتے ہیں جب اس نظریے کو اور اس کے درست اطلاقی حالات کو جانتے ہوں۔ لیکن کوئی بھی مذہبی بیانات کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مذہبی نظریات و بیانات کا بیان یا ابلاغ نہایت دشوار ہے۔

زبان بطور صورت اظہار اپنے عملی مقاصد میں بالکل ٹھیک رہتی ہے۔ لیکن جب اسے مختلف مابعد الطبیعیاتی یا تخمینہ کاری زاویوں سے وسعت دی جائے تو یہ اپنے نارمل وظائف سرانجام نہیں دے سکتی۔ روڈلف اوٹو کا کہنا ہے کہ ''مذہب میں سب سے زیادہ ممتاز بات کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا'' یہ مذہب کا غیر منطقی حصہ ہے۔ الفاظ میں بیان کیا جانے والا ذہب کا نظریاتی حصہ بہت اہم ہے۔ لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ کچھ اور بھی موجود ہے جسے الفاظ کا روپ نہیں دیا جا سکتا۔

مذہبی زبان

دانش مندانہ بیانات درست ہوتے ہیں یا غلط۔ لیکن اقوال کی دیگر اقسام بھی موجود ہیں جو نہ درست ہیں نہ غلط۔ مثلاً ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کا وزیر اعظم ہے''۔ اور ''خدا رحیم ہے''۔......دونوں بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ منطقی ثبوتیت پسندوں کے مطابق پہلا مفروضہ بے معنی اور غیر متعلقہ ہے۔ لیکن عموماً مذہبی لوگوں کا یقین ہے کہ دوسرا بیان نہ صرف قابل ادراک بلکہ درست بھی ہے۔ مزید برآں پہلا بیان تجربی ہے اور دوسرا مابعد الطبیعیاتی۔

جے۔ ایچ رینڈل مذہب کو انسانی سرگرمی کے طور پر تصور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب، جو ہمیں اب نظر آ رہا ہے۔ معاشی اعتبار سے اپنے ناگزیر وظیفے کے ساتھ ایک امتیازی انسانی جدوجہد ہے۔

برٹیرینڈ رسل نے کہا ''میں اس آدمی کا احترام کر سکتا ہوں جو دلیل دیتا ہے کہ مذہب درست ہے اس لیے اس پر یقین رکھنا چاہیے۔ لیکن ایسے لوگوں سے گہری نفرت رکھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ مذہب پر اس لیے یقین رکھنا چاہیے کیونکہ یہ مفید ہے اور اس کے درست ہونے نہ ہونے کا پوچھنا محض وقت کا ضیاع ہے''۔

آکسفورڈ کے ایک اور فلسفی بیسل مچل (Basil Mitchell) نے زور دیا ہے کہ مذہبی عقائد براہ راست طور پر قبل تصدیق یا قابل تکذیب نہ ہونے کے باوجود اپنے

کردار میں اصلی معنوں میں حقیقی ہیں۔

تصدیق اور جعل سازی کا سوال تجربی یا مابعد الطبیعیاتی بیانات کے مقابلے میں بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لہٰذا مذہبی زبان اگرچہ حقیقت بیان نہیں کرتی، لیکن بامعنی ہے۔ چنانچہ صداقت اور بطلان کا سوال اس کے حوالے سے پیدا نہیں ہوتا۔

مذہب میں علامات اور اساطیر

چونکہ مذہب زبان مذہبی احساسات و تجربات کو بیان کرنے میں کافی نہیں اس لیے علامات، تمثیلیں، اور اساطیر (قصے کہانیاں) مطالعہ مذہب میں متعارف کرائی گئیں۔ مذہب کی زبان علامات، اساطیر، استعاروں تشبیہات کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہے جو اہل مذہب کو اپنی ورائے سخن بصیرتیں اور تجربات بانٹنے اور بیان کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مختلف رسوم کی انجام دہی اور شعائر کے ذریعہ بھی یہی کام لیا جاتا ہے۔

مذہب علامتیت، شکل، مجسموں، صلیبوں سے رسومات اور اساطیر سے بچ نہیں سکتا۔ مذہب نے عقیدے پر توجہ مرکوز کرنے کی غرض سے شبیہیں استعمال کیں۔ لیکن جب وہ عقیدے سے زیادہ اہم ہو گئیں تو صنم پرستی نے جنم لیا۔ علامت لامحدود کو محدود کے تابع نہیں کرتی بلکہ محدود کو شفاف خیال کرتی ہے۔ ہمیں یہ اپنے اندر سے لامحدود کو دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔

پروفیسر اے این وائٹ ہیڈ کے مطابق علامات اور اشارے تمام تہذیبوں کی زبان ہیں آپ علامات کے بغیر نہیں سوچ سکتے۔ مذہب میں علامتوں کا استعمال نجی اور موضوعی ہے جبکہ ہماری زبان عوامی اور معروضی ہر مذہب اپنی مخصوص علامات رکھتا ہے مثلاً اوم ...... ہندوؤں کی، صلیب ...... عیسائیوں کی اور ہلال ...... مسلمانوں کی علامت ہے۔ مذہبی طبقات نے مخصوص علامتیں استعمال کی ہیں مثلاً سورج، آگ، ستارہ، آسمان، سمندر، مچھلی، انڈہ، بھیڑ وغیرہ۔ عبادت کے دوران ہم لوگ ارتکاز فکر اور مراقبہ کے لیے مختلف صورتیں یا علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ ذہن حقیقی سے مجرد کی جانب پرواز کرتا ہے۔

اور مجرد سے مطلق کی جانب۔ یہی وجہ ہے کہ ویدانت شبیہ پرستی یا علامت پرستی‘ مجرد تصاویر کی پوجا کرنے کی مذمت نہیں کرتا۔ سوامی ویوکانند کے مطابق ساری کائنات ایک علامت اور دیوتا اس کے پیچھے موجود جوہر ہے۔ ویدانت فلسفہ میں ہر چیز اپنا نام اور صورت رکھتی ہے۔

مختلف مذاہب کی متعدد رزمیہ نظموں اور صحائف کی اسطوریات میں استعارے اور تمثیلیں استعمال کی گئیں۔ اسطوریات دیوتاؤں کا ماخذ و کردار اور ان کی سرگرمیاں بیان کرتی ہیں۔ یہ اساطیر بالعموم علامتی اور استعاراتی ہیں۔ میکس ملر کا کہنا ہے کہ ”اساطیری دنیا بنیادی طور پر سراب کی دنیا ہے“ لیکن ہندو مذہب کے نکتہ نظر سے یہ بات درست نہیں۔

فلسفہ تمام مذہب کا جوہر ہے۔ اساطیر عظیم افراد کی کم یا زیادہ افسانوی زندگیوں‘ حیرت انگیز چیزوں کی کہانیوں اور قصوں وغیرہ کے ذریعہ مذہب کو واضح اور شفاف بناتی ہیں

مذہب اور حقیقت

مذہب ایک اخلاقیاتی اصطلاح ہونے کی وجہ سے مختلف مفکرین نے اسے مختلف انداز میں تصور کیا ہے۔ لیکن دراصل ”حقیقی“ (جیسا کہ ہم پیچھے دیکھ آئے ہیں) کثیر نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اسے واحد حیثیت سے لینا ہوگا۔ فہم عامہ کی رو سے دنیا چیزوں کی تعداد کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ فلسفیانہ فکر ہمیشہ وحدت پرستی کی جانب مائل ہوتی ہے۔ وحدت پرستی ایک فلسفیانہ نظریہ ہے۔ جس کے مطابق کائنات کی تہہ میں صرف ایک حقیقت مطلق موجود ہے۔ چنانچہ دنیا میں کوئی تکثیریت یا دوئی موجود نہیں۔

ہم نے دنیا میں مختلف مذاہب کا مشاہدہ کیا ہے...... ہندومت‘ عیسائیت‘ اسلام‘ بدھ مت‘ جین مت وغیرہ۔ یہ مختلف مذاہب مختلف مذہبی اصول اور نوعیت کے حامل ہیں لیکن انجام کار تمام دریاؤں کے سمندر میں گرنے کی طرح ہی تمام مذاہب دنیا کی جانب

لے جاتے ہیں۔خدا تمام مذاہب کا مرکز و محور ہے۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام مذاہب کی منزل مقصود خدا کو پانا ہے۔ یہ منزل حاصل کرنے کے لیے مختلف مذاہب نے اپنی موزونیت کے مطابق مختلف راہیں اختیار کیں۔ چنانچہ مذہب میں ہمیں کثرت میں وحدت ملتی ہے۔یہ وحدت اپنی فطرت میں توحیدی ہے۔

ہیگل کے خیال میں حقیقت ''مطلق'' ہے۔وہ کہتا ہے کہ حقیقت مطلق کثرت میں وحدت کا اصول ہے۔ سپنوزا کا توحیدی نظریہ جوہر (Substance) ہے' دنیا کی حقیقت مطلق۔اس کے مطابق یہ جوہر خدا ہے دنیا میں تمام اشیاء بشمول افراد خدا کی مادی صفات کے انداز ہیں خدا بطور مجرد مانا جاتا ہے۔وہ کثرت کو وحدت میں مدغم کرتا ہے۔کثرت ظاہری صورتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔چنانچہ سپنوزا نے خدا کو فطرت سے شناخت کیا۔

ساری ہستی کا مجموعہ ''حقیقی'' ہے۔اس میں کچھ بھی نارسا نامکمل یا غیر کامل موجود نہیں۔حقیقت ایک مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔روح حقیقت مطلق ہے۔ یہ کامل اور لافانی ہے۔ بریڈ لے اتفاق کرتا ہے کہ حقیقت اپنے اندر تمام ظاہری صورتیں لیے ہوئے وحدت ہے۔لیکن بریڈ لے۔کے خیال میں یہ صورتیں حیقت کے مشمولات (مافیہات Contents) کو تشکیل دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ لازماً کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہیں اور حقیقت سے باہر کہیں نہیں ہوسکتیں۔حقیقت مطلق اس قسم کی ہے کہ اپنی تردید نہیں کرتی۔ بریڈ لے کے نکتہ نظر اور شنکر کے ادویت ویدانت (غیر ثنائی ویدانت) میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔شنکر کے مطابق صرف برہما حقیقی ہے اور باقی سب چیزیں غیر حقیقی۔تاہم شنکر صورتوں کے بارے میں بریڈل کے نکتہ نظر سے اتفاق نہیں کرتا شنکر کی بیان کردہ ''حقیقت'' کا صورتوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی صورتوں کی حقیقت سے۔

یہ حقیقت ''ہونے'' اور ''بننے'' کا بعد الطبیعیاتی اور مذہبی شعور ہے۔اپنشد میں کہا گیا:

مجھے غیر حقیقی سے حقیقی

تاریکی سے روشنی

موت سے ابدیت کی جانب لے چلو

مذہب اور سماجیات

ہربرٹ سپنسر کے خیال میں سماجیات (سوشیالوجی) کے میدان یہ ہیں: خاندان سیاست' مذہب' معاشرتی نظم اور صنعت اور کام۔ یہ امر حقیقت ہے کہ انسان معاشرے سے الگ تھلگ زندگی نہیں گزار سکتا۔ آج مزہب کا مطمع نظر صرف نجات ہی نہیں بلکہ یہ سماجی بہبود' سماجی تعلقات' سماجی روابط اور قومی استحکام کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ مذہب انسانوں کی بہتری کے لیے ہے۔ سماجی بہبود اور انسانیت کی خدمت تمام مذاہب کی صدا ہے۔ سوامی ویوکانند نے کہا تھا کہ وہ مکتی نہیں چاہتے بلکہ معاشرے کے غریب پسے ہوئے اور ضرورت مند افراد کی خدمت کرنے کے خواہش مند ہیں۔

میکس ویبر کی نظر میں سماجیات اور مذہب کے بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ مذہب اور اقتصادی مظہر منحصر باہم ہیں۔ ان دونوں کے درمیان باہمی تعلقات موجود ہیں۔

۲ مذہب اور مذہبی اقتصادی عوامل اکیلے اکیلے موزوں طور پر سماجی زندگی کے حقائق بیان نہیں کر سکتے۔ ایک بہتر اور بھرپور سماجی زندگی کے لیے ہمیں مذہب اور اقتصادیات دونوں کی ضرورت ہے۔

۳۔ تاہم مذہب یا اقتصادی نظام پر غور وخوض کرکے سماجی زندگی کا مطالعہ کرنا ممکن ہے اور

۴۔ ویبر مثالی معاشرے پر یقین رکھتا ہے۔

درحقیقت مذہب اور سماجیات ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں کیونکہ دونوں ہی زندگی کو بھرپور ترین اور اعلیٰ ترین بنانا چاہتے ہیں۔

تاہم مذہب اور سماجیات کے درمیان کچھ تفاوت موجود ہیں۔ سماجیات انسانی

معاشرے کے ڈھانچے ماخذ اور ترقی کی سائنس ہے۔ یہ انسانی معاشرے کی عادات‘ انداز و اطوار‘ روایات اور رسوم کی تحقیق کرتی ہے۔ مذہب خدا کی موجودگی اور روح کی لافانیت کو شرط اولین قرار دیتا ہے۔ مذہب کے برعکس سماجیات سماجی واقعات کے تخلیقی اور تعمیری پہلو پر زور دیتی ہے۔

لیکن مذہب اور سماجیات دونوں قدر پر مشتمل ہیں۔ اگر کسی معاشرے کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی اقدار پر ہے وہ زیادہ مہذب اور منطقی بن سکتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مذاہب اور اخلاقیات کی قدر بھی وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی ہے۔ بدھ مت کے مطابق تبدیلی حقیقت ہے۔ معاشرے میں تبدیلی خوشحالی اور ترقی کا باعث ہے معاشرے میں مہذب اور مثالی کردار کی تعمیر کرنے کی خاطر ہمیں معاشرے کی مذہبی قدر پر زور دینا ہوگا۔ مذہب کی کچھ اقدار نہیں بلکہ صرف انسانی اقدار...... سچائی‘ مخلص رویہ محبت اور عدم تشدد ہیں۔

مذہب اور سائنس

آج ہم سائنس کے عہد میں زندہ ہیں۔ ہر سائنسی چیز ہماری توجہ حاصل کرتی ہے اور ہم اسے درست تسلیم کرتے ہیں سائنسی ترقی ہمارے ہاتھوں میں ایسے اختیار اور آلات دے دیے ہیں کہ ہم مجموعی طور پر ایک اچھی زندگی کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

سائنس ایک ترتیب یافتہ علم ہے۔ سائنسی علم سے ہماری مراد وہ علم ہے جو قطعی بے کم وکاس پوری طرح منظم اور حقیقی ہو۔ مذہب علم کا مخالف نہیں بلکہ علم کا جزو تکمیلی ہے۔ سائنس کسی شخص کی ہر اعتبار سے ترقی کو اپنا مقصد بناتی ہے اور خوشحال گزر بسر مہیا کرتی ہے۔ مذہب کا بھی یہی کام ہے۔ تاہم سائنس اور مذہب کے درمیان کچھ امتیازات موجود ہیں۔

سائنس ممکن سادہ ترین انداز میں تجربہ کی حقیقت کا مکمل اور باثبات بیان ہے۔ سائنس دان کسی بھی میدان میں تحقیق سے پہلے حقائق اکٹھے کرتا ہے۔ پھر ان کا تجزیہ اور

درجہ بندی کرتا ہے۔ انہیں پیدا کرنے والے مخصوص حالات کا مطالعہ کرتا ہے' ان کے طرزِ عمل کے یکساں طریقوں کی کانٹ چھانٹ کرتا ہے اور اس سب کو ترتیب یافتہ مقالہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

دوسری جانب مذہبی آدمی اپنے مذہبی تجربات کے لیے عقیدے' اشتیاق' سچائی وغیرہ کو مدِنظر رکھتا ہے۔ مذہب کے موضوعی تجربات وسیع معلومات حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں تذبذب روحانی کی زندگی ہے جو سہی پاکیزگی یا مبہم مذہبی جنون سے مختلف ہے۔ مذہب ایک بے لطف باقاعدگی یا توہم پرستانہ عقیدہ نہیں۔ موزوں حوالے سے لیا جائے تو مذہب لاشعور کی عام اسفل حالت سے ایک بڑی تفہیم کی جانب تبدیلی ہے جس میں ہم اپنی حقیقی ہستی پاتے ہیں۔ یہ علم سے طمانیت تک کی رفعت ہے۔

مذہب اور سائنس کے متعلق مندرجہ بالا باتوں سے ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ دونوں آپس میں متضاد ہیں۔ سائنس اور مذہب اپنے اپنے مسائل رویوں طریقہ کار سرگرمیوں اور نتیجے کے اعتبار سے متفاوت ہیں تاہم ان میں متعدد مشترک عناصر بھی ہیں۔ مذہب خدا کا منکشف کردہ لفظ ہے جیسا کہ ہمیں دنیا بھر کے صحائف سے پتہ چلتا ہے...... اور سائنس فطرت کا منکشف کردہ لفظ ہے جیسا کہ ہم دنیا کی حقیقی چیزوں میں دیکھتے ہیں

عہدِ جدید میں عظیم طبیعیات دانوں مثلاً جیمز جینز اور ایڈنگٹن نے ثابت کیا ہے ہ سائنس تحقیق کی دورترین حد تک چلی جانے کے بعد بھی بنیادی کائناتی سلسلہ بدستور غیر حل شدہ ہے اور مذہبی غور وفکر سے علاوہ حقیقت کی فطرت اور اہمیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ایک اور سائنس دان سر اولیور کہتا ہے: ''مذہب جانی دشمن کے طور پر آغاز لینے والی سائنس آخر کار اس کی عاجز ترین خادمہ بن گئی'' البرٹ آئن سٹائن کے مطابق سائنس خدا کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے نہ مسترد۔

لہٰذا ہمیں سائنس اور مذہب کے درمیان کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ملتا۔ یہ دونوں مل کر

ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں ۔دونوں کے مابین فرق بہت کم ہیں ۔

درحقیقت الوہی قانون (اہل دینیات کے الفاظ میں) کو ہی سائنس دان فطری قانون کہتے ہیں ۔دونوں ایک دوسرے کے برخلاف نہیں جا سکتے ۔مذہب ہی نہیں بلکہ سائنس بھی انسان کی جائز دستوری ضرورت ہے' جیسا کہ آئن سٹائن نے کہا ''سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا''۔

مذہب اور سیاست

سیاست حکومت کی سائنس ہے ۔یہ ریاست میں حکومت کے خدوخال اور وظائف بیان کرتی ہے ۔یہ نجی اور عوامی فلاح کے حصول کے لیے افراد کی سیاسی سرگرمیوں کو قاعدہ دیتی اور قوانین متشکل کرتی ہے ۔مذہب کی سرگرمیاں سیاست سے مختلف ہیں ۔جب ایک شخص زندگی کی موضوعی جہتوں سے نمٹتا ہے تو دوسرا زندگی کی معروضی جہتوں پر غوروفکر کرتا ہے ۔چنانچہ سیاست اور مذہب کا موضوع' نوعیت اور مقاصد ایک جیسے نہیں ۔میورہیڈ (Muirhead) کا کہنا ہے: ''آپ پارلیمانی نظام کے ذریعہ انسانوں کو اخلاقی نہیں بنا سکتے' اس کے خیال میں سیاست کا اخلاقیات یا مذہب سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ۔

تاہم افلاطون اور گاندھی جیسے عینیت پسند مفکرین اعتقاد ہے کہ مذہب اور سیاست کے عناصر باہم متضاد نہیں ۔سیاست میں بہتر منتظم سرکاری کے لیے افراد کا مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے ترقی یافتہ ہونا ضروری ہے ۔افلاطون کو یقین ہے کہ اگر ''فلسفی بادشاہ'' ہوں تو حکومت عوام کے لیے بہتر طور پر کام کرسکتی ہے ۔اکا مطلب یہ ہے کہ ریاست میں اچھی سیاست کرنے کی خاطر سیاستدانوں کو مذاہب کا مطالعہ کرنا ہوگا ۔افلاطون نے کہا کہ انسان بجائے خدا کی فرمانبرداری کرنی چاہیے ۔اسی طرح سقراط اپنی ''اعتذار'' میں کہتا ہے کہ ''میرا یقین ہے کہ خدا کے لیے میری خدمت سے بڑھ کر ریاست میں آج تک کوئی زیادہ اچھا کام نہیں ہوا''۔افلاطون کا فلسفی بادشاہ قوانین خود

غرضی سے بالاتر ہے۔ایک فلسفی بادشاہ مثالی ریاست قائم کرنے کے لیے حقیقی راست کار ہے''۔

اگر ہم قدیم تاریخ کی ورق گردانی کریں تو بڑی آسانی سے نظر آئے گا کہ بادشاہتیں الوہیت کے ساتھ منسلک تھیں۔قدیم حکایتوں کے مطابق حمورابی کو ضابطہ قانون خود دیوتا نے لکھوایا۔یونانی سکندر سورج دیوتا کا بیٹا تھا۔اخناتون نے بھی خود کو آتن (سورج دیوتا) کی اولاد بتایا۔دوارکا کا بادشاہ سری کرشن ایک مذہبی بانی ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سیاست دان اور ڈپلومیٹ بھی تھا۔اسی طرح دسرتھ' جنک' رام چندر' راون' اشوک وغیرہ محبت کے لیے گہری تعظیم رکھنے کے علاوہ قابل منتظمین اور سیاست کار بھی تھے۔متعدد مذہبی کتب کا موضوع مذہب اور سیاست دونوں ہیں۔

عہد حاضر میں معاشرہ کے اندر امن اور ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے مذہب اور سیاست کو ساتھ ساتھ کام کرنا ہوگا۔مذہب اور مذہبی ادارے میں بھی سیاست کو ملوث نہیں کرنا چاہیے۔ہمیں متعصب اور کسی مذہب کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔مذہب ہی قومی اتحاد اور معاشرہ میں سماجی' ثقافتی اور سیاسی تحفظ قائم کرنے میں مدد کرسکتا ہے۔

مذہب اور اقتصادیات

ایک سائنس کے طور پر اقتصادیات کا تعلق دولت کے ساتھ ہے جو انسانی خواہشات کو پورا کرتی ہے۔یہ خواہشات کو تسکین دینے والی اشیاء کی پیداوار تقسیم اور استعمال کا مطالعہ کرتی ہے۔Buck اور Slesinger کے مطابق اقتصادیات انسان کی ان سرگرمیوں کا مطالعہ ہے جو تسکین خواہشات کی خاطر مادی ذرائع حاصل کرنے سے وابستہ ہیں۔

جہاں تک اقتصادیات اور مذہب کی سرگرمیوں کے طریقہ کار اور نوعیت کا معاملہ ہے یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں۔لیکن ان کے باوجود ان میں کچھ مماثلتیں بھی پائی

جاتی ہیں ۔مذہب کا مقصد سچائی‘ خوبصورتی اور نیکی کی زندگی مہیا کرنا ہے۔۔ مادی خواہشات کی تسکین کے لیے اقتصادیات معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں ۔

اقتصادیات اور مذہب فرد اور معاشرے کی ترقی کے لیے مادی فلاح مہیا کرتے ہیں۔

اقتصادیات مادی خواہشات پورا کرتی ہے تو مذہب ہمیں روحانی قوت اور سوچ مہیا کرتا ہے ۔انسان صرف دنیا کے مادی پہلوؤں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ ہمیں ذہنی سکون اور سعادت نہیں دیتے ۔

اقتصادیات کا حتمی مقصد جسے دولت کہتے ہیں مذہب کا بھی ایک حتمی مقصد بن جاتا ہے ۔ہندو صحائف کے مطابق ہر ایک فرد کی زندگی کے چار مقاصد ہیں راست باز زندگی‘ دولت وثروت کا حصول‘لطف اٹھانے کی خواہش اور روحانی نجات ۔

بلاشبہ یہ درست ہے کہ دولت معاشرے کی موجودہ حالت میں ناگزیر ہے ۔مذہب اور اقتصادیات دونوں میں انسان کا یہ مقصد مادی فلاح کے لیے ہے ۔تاہم ہماری کمائی نیکی کی راہ کے مطابق ہونی چاہیے۔دولت کے ذرائع اچھے ہونے چاہئیں ۔

☆☆☆

۴ :: روح کی لافانیت

''آتما لافانی ہے''۔(گیتا)

عہد سائنس میں لوگ زندگی کی تمام مسرتوں کا لطف اٹھاتے ہیں ہر چیز کا بہت استعمال کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ موت کے بعد کیا ہوگا۔ زمین پر ہماری زندگی کے مختصر عرصہ کے دوران ہماری کچھ امیدیں اور تمنائیں بے تسکین رہی ہیں۔ بارہا سوال اٹھایا گیا کہ انسان کچھ دیر کے لیے ہی کیوں زندہ رہتے' مخصوص خواہشات پوری کرتے' شاندار اعمال سرانجام دیتے' کسی حیرت انگیز قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پھر غیر متوقع طور پر انہیں اپنے منصوبے اور زندگیوں کے کام ادھورے چھوڑ کر جانا کیوں پڑتا ہے؟ کوئی بھی اپنا اختتام جلد آنے کی خواہش نہیں کرتا۔ بلکہ سائنس لوگوں کو طویل اور صحت مند زندگی مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فن طویل ہے اور زندگی مختصر۔ اور مختصر عرصہ حیات میں آپ اپنی خواہشات کی تسکین نہیں کرسکتے۔ اور لافانیت کا تصور انسانیت کے لیے ہمیشہ دل فریب رہا ہے۔ سائنس دانوں' فلسفیوں اور منطقیوں سب نے حل کر موت اور لافانیت کا اسرار حل کرنے کے لیے غور وفکر کیا۔ بہ الفاظ دیگر لافانیت کی انسانی خواہش حقیقی ہے۔ لافانیت سے ہماری مراد ذاتی نکتہ نظر سے عاری وجود کی کوئی بھی صورت نہیں بلکہ ایسی ذاتی لافانیت ہے جس میں شعور کا موجودہ ارتکاز قائم رہے۔ اور اس کے بعد کی ہستی شخصیت کا حقیقی تسلسل ہے جو اس زمین پر ایک متعین انداز میں متشکل کیے اور ڈھالے جانے کے عمل میں ہے۔

عام طور پر ہم روح کی لافانیت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مادی اشیاء اور تجربات سے لطف اٹھاتے رہیں یا روح مکتی حاصل کرلے گی۔ مادے کا وجود اور علم کا وجود روح کے شعور پر منحصر ہے۔ اگر روح بدستور موجود رہتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوگا' اور اس کا مقدر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے میں جدید سائنس ہماری مدد نہیں کرتی۔ یہ مسئلہ بہت گہرا ہے۔ کیونکہ لافانیت کا سوال عام آدمی کے لیے انتہائی

مشکل ہے۔ روح کی لافانیت کے حق میں مخصوص دلائل پیش کیے جاتے ہیں' لیکن انہیں کسی بھی اعتبار سے ثبوت خیال کیا جا سکتا۔

(۱) سائنس کی بنیاد پر دلیل

سائنسی نکتہ نظر سے لافانیت کا مطلب موت سے بالاتر ہونا یا ایسی حالت ہے جو موت کے ماتحت نہیں۔ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ توانائی کے ساتھ ساتھ مادہ بھی فنا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مادے کا ہر ذرہ چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ قطعی فنا یا موت کے تابع نہیں اور اس مفہوم میں ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ مادہ غیر فانی ہے' توانائی غیر فانی ہے قوت غیر فانی ہے کیونکہ انہیں تباہ یا فنا نہیں کیا جا سکتا۔ا کائنات کا مادہ اور توانائی بدستور موجود رہتے ہیں جنہیں بڑھایا جا سکتا ہے۔ نہ گھٹایا۔ مثلاً جب کسی مادی چیز کو آگ میں جلایا جائے تو وہ آگ کے جلنے کے بعد دونوں حالتوں میں ایک ہی جتنی مقدار کا مظاہرہ کرے گی۔ اسی طرح بدن تباہ ہونے سے روح تباہ نہیں ہوجاتی۔

(۲) علم کی بنیاد پر دلیل

کسی شخص کا علم احساس' رغبت اور سوچ پر منحصر ہوتا ہے۔ عقلی زندگی ایسے اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے کہ ہم زمان و مکان کی قید سے ماورا ہوسکتے ہیں۔ سوچ محدود نہیں' اپنے حافظے میں ہم دور افتادہ ماضی میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور تخیل کے ذریعہ نہایت دور کے مستقبل میں پرواز کرتے ہیں۔ چنانچہ حافظے کی طاقت سے ہم اپنی گزشتہ زندگی کو جاننے کے ساتھ ساتھ آئندہ کے واقعات کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ امر روح کی لافانیت اور غیر مختتم تسلسل کی جانب اشارہ کناں ہے۔ کبھی کبھی جوتش کی سائنس ہمیں روح کی ماضی و مستقبل کی سرگرمیوں کے بارے میں کافی مواد فراہم کرسکتی ہے۔ بلاشبہ ہمارا جسم تباہ ہوجاتا ہے لیکن روح لافانی رہتی ہے۔

(۳) مابعد الطبیعیاتی دلیل

روح کے متعلق مابعد الطبیعیاتی دلائل مشرقی اور مغربی دونوں مکتبہ ہائے فکر کا احاطہ

کرتے ہیں۔ افلاطون نے روح کو مرکب حقیقت کے طور پر خیال کیا جو اپنے خط و خال میں سادہ ہے۔ ایک سادہ مرکب (Substance) کی حیثیت سے روح غیر فانی ہے مختلف الاجزاء مرکب تحلیل ہو جاتا ہے۔ لیکن کوئی سادہ مرکب لازماً نا قابل فنا ہو جاتا ہے۔ دوم افلاطون کو یقین ہے کہ روح کا جوہر الوہی ہے لہٰذا یہ لافانی ہوئی۔ یہ اپنی فطرت میں ابدی ہے۔ چنانچہ افلاطون کے مطابق روح تحلیل اور موت سے بالاتر ہے۔

ڈیکارٹ نے بھی یہی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ روح خالص شعور یا مرکب کا تحت طبق (Sub-Stratum) ہے۔ شعور نا قابل فنا اور موت سے مبرا ہے سپنواز کہتا ہے کہ انسان صرف اس حد تک لافانی ہے کہ وہ حساسیت سے آزاد خالص استدلال کی زندگی میں حصہ لیتا ہے۔ طبعی جسم، جو روح پر مشتمل ہے، اگر جذبات اور تعصبات سے پاک ہو جائے تو لافانی بن جاتا ہے۔ خدا کی عقلی محبت حاصل کرنے والی روح ابدی اور لافانی ہے۔

لیبنیز (Lebniz) لافانیت کو تمام لوگوں تک وسعت دیتا ہے۔ اس کے مطابق روح موت کا شکار نہیں ہوتی کیونکہ ایسا ہونے سے حقیقت کے تسلسل میں وقفہ آ جائے گا۔ لیبنیز کے خیال میں موت صرف ظاہری ہے، حقیقی نہیں۔

کانٹ نے ہماری اخلاقی زندگی کی اخلاقیات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنا موضوع بنایا۔ اس کے مطابق اخلاقی قانون ایک زمرہ بند ناگزیر ہے جو انسان سے غیر مشروط تعمیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ تجربی عناصر سے آزاد ہے۔ یہ ناگزیر زمرہ بندی عالم گیر اخلاقی قانون ہے جس کا کسی خارجی مقصد سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ کانٹ کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی عقیدے کی رو سے روح لافانی ہے۔

(۴) اخلاقی دلیل

اخلاقی روایات پرستوں میں سے ایک باثر اخلاقی روایات پرست جی ای مور کہتا

ہے کہ تمام اخلاقی مفروضوں کی بنیاد نظریہ نیکی پر ہے۔ ''نیکی'' کی کوئی تعریف نہیں کیونکہ یہ سادہ ہے اور کوئی جزو نہیں رکھتی۔ نیکی کا طریقہ نا قابل تحلیل (Unanalysable) ہے جو بالکل نظریہ روح جیسا ہے ''نیکی'' کی طرح اگر ''روح'' سادہ ہے تو اسے فنا کیا جا سکتا ہے۔ پھر روح ابدی اور لافانی ہے۔

(۵) مذہبی......فلسفیانہ دلیل

دنیا کے بڑے مذاہب...... ہندومت' عیسائیت' اسلام...... کا ایک ہمہ گیر نظریہ روح کی لافانیت کے بارے میں ہے۔ ان تین بڑے مذاہب کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ روحیں صرف ایک مرتبہ تخلیق ہوتی ہیں اور مخصوص کام کرنا جاری رکھتی ہیں۔ لیکن انہیں اپنی ساری ابدیت کے دوران سزا یا جزا پانی پڑتی ہے۔ اگرچہ روحیں آج موجود ہیں اور ابد تک موجود رہیں گی' تو وہ ازل سے موجود رہی ہوں گی' اور جو کچھ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اس کا دوبارہ ظہور لازماً ہوگا۔

فلسفہ بدھ مت کے مطابق کچھ بھی پائیدار نہیں۔ ہر چیز ہمہ وقت روبہ تغیر ہے۔ قانون تغیر ہمہ گیر ہے۔ چنانچہ دائمی روح کا وجود مسترد کر دیا گیا ذات محض شعور کا دھارا ہے۔

تنقید

ا۔ مغربی اور مشرقی فلسفیوں نے روح کی لافانیت کے مسئلے کا ایک ہی انداز میں مطالعہ نہیں کیا۔ مغرب میں لفظ Soul کا مطلب ذہنیت ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ قطعی مختلف ہے۔ ہم ذہنی فعالیت کو روح کی حقیقی فطرت کے ایک حصے کے طور پر نہیں سمجھتے۔ ہم ذہنی قوتوں اور وظائف کو ذہن یا مانس کی اصطلاح کے ماتحت شامل کرتے ہیں۔ ''مانس'' سے مراد تمام اقسام کی نفسی سرگرمی ہے' لیکن ذہن سے ماورا کوئی ایسی چیز موجود ہے جسے مغربی فلسفہ دان شاید نہیں جانتے۔ جرمن فلسفی کانٹ نے اسے جاننے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا یہ انسانی تخیل ہمارے ذہن سے ماوراء اور نا قابل بیان ہے

حتیٰ کہ اب بھی ہمیں روح کی نوعیت کے حوالے سے معاصر مغربی فلسفیوں سے کسی اور بات کی توقع نہیں۔

ہندوستانی فلسفیوں کی نظر میں روح ''آتما'' ہے۔ ہم روح کی نوعیت کا مشاہدہ قدیم صحائف سے کرتے ہیں۔ روح کی حقیقی نوعیت ذہنی سرگرمیوں سے مختلف ہے۔ حتیٰ کہ یہ اصول فکر یا انا سے بھی جدا ہے۔ چنانچہ نفس کی لافانیت آتما کی لافانیت ہے نہ کہ ذہن کی۔

۲۔ مغربی دانش وروں نے روح کو ذہنی وجود کے مفہوم میں سمجھا ہے' اس لیے انہوں نے لافانیت کا ایسا معنی پیش کیا جو مشرقی فلسفیوں کے پیش کردہ معنی جیسا نہیں روح کی طرح لافانیت کا مطلب بھی واضح نہیں بلکہ بہت مبہم ہے۔

۳۔ سائنس کہتی ہے کہ لافانیت کا مطلب ہے کہ موت نہ آنا۔ لیکن یہ ایک غلط تصور ہے آپ موت کے بعد بھی لافانی ہو سکتے ہیں۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ہر شے پر تغیر کا راج ہے۔ اور اسی تغیر کے اندر ہم مختلف سرگرمیاں اور صورتیں پاتے ہیں۔ کیفیت یا صورتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن مقدار میں نہیں۔ اگر ہر چیز روبہ تغیر ہے تو پھر وہ لافانی وجود کہاں ہے؟ دنیا میں قطعی ناقابل تغیر کے طور پر کوئی چیز نہیں۔

جدید سائنس نے سارے مظہر کو دو حالتوں میں تقسیم کر کے مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی مادہ اور توانائی لیکن ایک تیسری چیز شعور بھی ہے۔ جس کی وضاحت کرنے میں سائنس دان ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔

۴۔ جہاں تک روح کی لافانیت کا معاملہ ہے' ہمارا علم مخصوص ذہنی حوالوں تک محدود ہے یعنی' احساس' خواہش اور سوچ۔ اگر انفرادی اور روح کل ایک ہی ہیں تو پھر ہمیں روح کی لافانیت کا مسئلہ حل کرنے کے لیے انفرادی روح اور روح کل کا علم لازماً حاصل کرنا ہوگا۔ خدا کو جاننا خدا بن جانا ہے۔ لہذا ہمیں اگر خدا کو جاننے کی خواہش ہے تو اپنی حقیقی ذات کو جاننا لازمی ہے۔ جو لافانی الوہی' ازلی' ابدی اور واحد ہے۔

۵۔ روح کی لافانیت کے متعلق مابعد الطبیعیاتی دلائل کے حوالے سے بھی ہم مخصوص حدود کے پابند ہیں۔ افلاطون نے خیال ظاہر کیا کہ روح ایک سادہ جوہر کے طور پر ناقابل فنا اور ناقابل تباہی ہے۔ اگرچہ روح اعیان کی قرابت دار ہے۔ تاہم یہ کسی عین سے مماثل نہیں۔ ہم کافی بہتر طور پر مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کہ ہمارا روح کی لافانیت کا کیس منطقی دلائل کی نوعیت والا ہونے کی نسبت خصوصی درخواست گزاری والی نوعیت کا زیادہ ہے۔

روح کی لافانیت کے لیے ڈیکارٹ کے دلائل شخصی لافانیت کو ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔ لیبنیز کہتا ہے کہ اگر اپنی موت کے بعد میں مکمل طور پر مختلف شخصیت میں کسی شناختی امکان کے بغیر بدل جاؤں تو پھر مرنے یا زندہ رہنے میں کیا فرق ہے؟ اگر میں موت کے بعد برطانیہ کا وزیراعظم بن جاؤں اور مجھے اپنا پچھلا جنم معلوم نہ ہو تو یہ فنائیت کے ہی مترادف ہے۔ چنانچہ ڈیکارٹ کی منطق لافانیت کو حقیقی معنوں میں ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

روح کی لافانیت کے بارے میں سپنوزا کا تصور صرف ان لوگوں پر قابل اطلاق ہے جنہوں نے جذبات و خواہشات پر فتح پالی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی لافانیت صرف فلسفیوں یا اولیاء تک ہی محدود ہے۔

روح اور لافانیت سے متعلق کانٹ کی فراست ہندوستانی مفکرین کے تصور آتما کے نکتہ نظر سے کامیاب نہیں۔ اس کا روح کی لافانیت کا تجزیہ منطقی نفسیات کا ایک مغالطہ آمیز استدلال ہے۔ تاہم کانٹ ہکسلے اور ارنسٹ ہیکل نے ایسی چیز دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو ناقابل تغیر اور مطلق سچائی ہے۔ لیکن کیا انہوں نے اسے واقعی دریافت کر لیا ہے؟

۶۔ ''نیکی'' اور ''روح'' کے تصورات کے بارے میں مور (Moore) کی منطق تشفی بخش نہیں۔ معروض یا حقیقتوں کے بغیر کسی بھی شے کو بالذات اچھا نہیں کہا جاتا۔ جبکہ

روح آزاد ہے۔ دوم ''نیکی'' یا اچھائی کا تصور نا قابل تعین یا نا قابل تحلیل ہے۔ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ ایک سادہ نا قابل تعین خاصیت کا نام ''اچھا'' کیسے ہوا؟

۷۔ ہمیں روح کی لافانیت کے بارے میں مختلف مذاہب عالم کے خیالات کا تنقیدی اور بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہندوازم کے مطابق روح کی جو نوعیت ہے وہ عیسائیت یا اسلام میں بیان کردہ نوعیت سے مختلف پائی گئی۔ عیسائیوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ روح کی لافانیت یا لافانی زندگی کو حضرت عیسیٰ مسیح روشنی میں لائے اور ان سے پہلے دنیا اس تصور کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ اور یہ کہ عیسیٰ کو وسیلہ بنائے بغیر کوئی بھی ابدی زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن روح کی لافانیت کا تصور ہندو، رومن، یونانی اور زرتشتی صحائف میں کہیں پہلے سے موجود تھا۔

ان حالات کے تحت اگر روح کی لافانیت کے مسئلہ کو دانش وروں اور سائنس دانوں کی تحقیق کے ماتحت لایا جائے تو بہتر ہوگا، تا کہ ایک قطعی نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

نتیجہ بحث

روح لامحدود اور لافانی ہے۔ یہ زمان و مکان اور علت و معلول سے ماورا ہے۔ لطیف ہونے کی وجہ سے یہ مر نہیں سکتی۔ اور نہ ہی کوئی بھی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ روح ایک قوت ہے نہ سوچ۔ یہ سوچ کی پیدا کنندہ ہے لیکن بذات خود سوچ نہیں یہ جسم ہے نہ احساس، یہ تا ابد آزاد اور ہر جگہ موجود ہے۔

دوئی پسندوں (Dualists) کا اعتقاد ہے کہ خدا، جو کائنات کا خالق اور حکمران ہے ازلی طور پر فطرت سے اور انسانی روح سے جدا ہے۔ خدا ازلی ہے فطرت ازلی ہے ازلی طور پر فطرت سے اور انسانی روح سے جدا ہے۔ خدا ازلی ہے فطرت ازلی ہے لہٰذا روح بھی ازلی ہوئی۔ دوئی پسند اور با قاعدہ غیر دوئی پسند دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ روح اپنی فطرت میں پاکیزہ ہے لیکن اپنے ہی اعمال کے ذریعہ غیر مقدس اور ناپاک ہو جاتی ہے۔

وحدانیت کے مطابق پوری کائنات میں صرف ایک وجود ہے‘ جو خدا یا برہمہ ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے ہر آدمی تین حصوں پر مشتمل ہے...... جسم‘ ذہن اور نفس (روح) روح انسانی جسم میں واحد وجود ہے جو غیر مادی ہے۔ غیر مادی ہونے کی وجہ سے یہ آمیختہ (Compound) نہیں ہوسکتی۔ اور آمیختہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ علت اور معلول کے قانون کی تابع نہیں‘ چنانچہ یہ لافانی ہے۔

خدا اس کائنات کا موجب ہی نہیں بلکہ مادی علت بھی ہے۔ علت اپنے معلول سے ہرگز مختلف نہیں ہوتی۔ معلول ایک اور شکل میں محض علت ہی ہے۔ یہ روحیں بھی خدا کا ایک جزو ہیں لامحدود آگ کی چنگاریاں لیکن خدائے مطلق کو جزئیات میں کیسے تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ اس مسئلے کا حل یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہر روح حقیقتاً محدود کا نہیں بلکہ لامحدود خدا کا ایک حصہ ہے۔

پانی کے لاکھوں قطروں میں منعکس ہونے والا سورج لاکھوں سورجوں کی سورت میں نظر آتا ہے۔ اور ہر قطرہ سورج کی ایک مضمر تصویر ہے۔ لیکن یہ سب عکس ہوتے ہیں نہ کہ حقیقی سورج۔ کائنات میں دو نہیں صرف ایک روح موجود ہے۔ یہ بے ازل و بے ابد ہے۔ یہ پیدا ہوتی ہے مرتی ہے یا دوبارہ جنم لیتی ہے۔ یہ زمان‘ مکان اور علت سے ماورا معلوم سے ماورا قابل علم سے ماورا روح ہے۔ روح خالص اور آزاد ہے۔

فریب یا مایا کے شکار لوگ میں اور تم مرد اور عورت میز اور دیوار کے درمیان فرق ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نام اور صورت کے دو فرق نظر انداز کر دیں تو ساری کائنات ایک ہے۔ چنانچہ ساری کائنات واحد ابدی وجود‘ روح کا عکس ہے۔ کائنات کا مجموعہ مادی‘ ذہنی اور روحانی اعتبار سے ایک وحدت ہے۔ صرف ایک وجود ایک ہستی موجود ہے جو رحیم و کریم‘ ہر جگہ موجود‘ علیم و خبیر‘ لاولد اور لافانی ہے۔ چنانچہ خدا اور انسان ایک ہی ہیں۔

یہ تمام مختلف خیالات...... مرد یا عورت‘ بیمار یا صحت مند‘ طاقت ور یا کمزور وغیرہ

……محض مغالطے ہیں لاعلمی اور فریب نظر کے علاوہ اور کوئی بھی چیز آپ کو نہیں باندھ سکتی ۔نفس کائنات کی واحد لامحدود ہستی ہے ۔اور ہماری ہستی بھی ۔ میں وہ ہوں اور تم وہ ہو۔اس کے حصے نہیں بلکہ مکمل ''وہ'' وہ موضوع بھی ہے اور معروض بھی وہ ''میں'' بھی ہے اور ''تم'' بھی ۔محض ظاہری صورتیں چیزوں کو آپس میں مختلف بناتی ہیں ۔

چنانچہ حاصل کلام یہ ہے کہ ساری کائنات خدا ہے اور اسی میں سے ظاہر ہوئی' اور اپنے ماخذ میں واپ لوٹنے کی جانب گامزن ہے۔ جیسے بجلی حرکی برقی مشین (Dynamo) سے باہر آتی سرکٹ مکمل کرتی اور واپس اسی میں لوٹ جاتی ہے۔روح کا معاملہ بھی یہی ہے۔ روح کائناتی روح میں نمودار ہوتی نباتاتی اور انسانی اقسام اور آخر کار آدمی میں سے گزرتی ہے اور آدمی خدا تک نزدیک ترین رسائی ہے۔

☆☆☆

۵ :: بندش اور آزادی

''آزادی کسی بھی قابل قدر مفہوم میں صرف اس بات کی طالب ہے کہ ہمارے ارادے ہماری اپنی خواہشات کا نتیجہ ہوں' نہ کہ کسی بیرونی قوت کا جو ہمیں ایسی چیز کا ارادہ کرنے پر مجبور کرے جسے ہم نہیں کرنا چاہتے...... (برٹرینڈ رسل)''۔

بندش

ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ایک فطری میلان ہے کہ ہمارا ذہن ایسی چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے جو خوشگوار ہیں یا خوش کن احساسات پیدا کرتی ہیں۔ کسی بھی ناخوشگوار یا ناخوشگوار احساسات پیدا کرنے والی چیز سے ہم دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ من پسند چیزوں کی کشش اور ناپسندیدہ چیزوں سے گریز ایک ہمہ گیر میلان ہے۔ چنانچہ دو چیزیں موجود ہیں: ایک کشش اور دوسری اجتناب۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسرت انگیز چیزیں ہمیں کھینچتی ہیں' اور دردانگیز چیزیں' جو تکلیف دہ اور تخریبی احساس پیدا کرتی ہیں ہمیں پرے دھکیلتی ہیں۔ اگر ہم مسرت کے متمنی ہیں اور تکلیف دہ یا ناپسندیدہ احساسات سے گریز کی کوشش کر رہے ہیں تو ہم آزاد نہیں' بلکہ بندش میں ہیں۔ ہمارا پیش منظر بہت تنگ اور محدود ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس لگاوٹ کو سدراہ خیال کیا جاتا ہے۔ ایک آزاد روح کسی چیز یا مخصوص قسم کے احساسات سے منسلک نہیں ہوتی۔

انسان اپنی زندگی کے ہر لمحے میں مخصوص چیلنجوں کا سامنا کرتا ہے جو اس کی آزادی کو فرماتے ہیں۔ چیلنج رنگارنگ ہیں اور زندگی کے کسی بھی حصے میں پیش آتے ہیں۔ جب بھی ہم ان چیلنجوں سے آگاہ ہوتے ہیں (جیسا کہ ہم اس مصروف دنیا میں اپنے متعلق سوچنے کا وقت ملنے پر کرتے ہیں) تو بادل نخواستہ ان چیلنجوں کے لیے اپنے جواب کا ناکافی پن تسلیم کرتے ہیں جو مسلسل ہمیں درپیش رہتے ہیں۔ ہندوستانی اصطلاح میں یہ ناکافی پن ''بندش'' یعنی ''باندھ'' ہے۔

آزادی

بالعموم ''آزادی'' سے مراد بیرونی قوت کے ذریعہ سے جبر یا بندش کا نہ ہونا ہے۔ غلام کے لیے آزاد نہیں کیونکہ دیگر انسان اسے پابند کرتے ہیں۔ پنجرے میں بند شیر آزاد نہیں کیونکہ وہ سلاخوں میں قید ہے۔ جب کوئی شخص اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ انتخاب کرسکے، تبھی وہ آزادی کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس بات کا فیصلہ اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے اور کہ وہ نیکی کی راہ اپناتا ہے یا بدی کی۔ کانٹ کے خیال میں ارادے کی آزادی فلسفہ کی شرط اولین ہے اس کو ثبوت کی ضرورت نہیں۔ آزادی اخلاق کی انتہائی بنیاد ہے۔ اخلاق اور مذہبی زندگی صرف حقیقی ہے اور یہ آزادی کے بغیر حقیقی نہیں ہوسکتی۔ ہماری حکومت کی بنیاد انفرادی آزادی کے اصول پر ہوتی ہے۔ دنیا بھر کے لوگ سیاسی آزادی چاہتے ہیں...... بولنے کی آزادی حریت کی آزادی، وغیرہ۔ مشرقی فکر میں روحانی نجات کا تصور تقریباً سبھی مذاہب کی آخری منزل ہے۔

آزادی اور خودمختاری

انسانی روح یا نفس صرف ایک انفرادیت ہی نہیں، بلکہ ایک شخصیت بھی ہے۔ ہماری اخلاقی زندگی کے سیاق میں شخصیت خودمختاری کے ذریعہ متعین ہوتی ہے۔ زندگی ذہن کی جبلتوں، تحریکوں اور ہیجانات پر مشتمل ہے۔ انسان احساسات و جذبات کو منظم رنے اور ترتیب میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے، تاکہ کوئی مقصد یا منزل پاسکے۔ چونکہ انسان اپنی تحریکوں اور جذبات پر قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ خودمختار شخصیت اور آزاد ہے۔ ایک خودمختار شخصیت فطرت کی قوتوں، اندرونی یا بیرونی، میں پابند نہیں ہوتی۔ انسان اپنی منطقی فطرت کی مدد سے خود ہی کسی تصور یا مقصد کی جستجو کرنے کا انتخاب کرنے میں آزاد ہے۔

لیکن آزادی کا مطلب لاتعینیت (Indeterminism) نہیں۔ اس سے مراد انتخاب سے بے تعلقی بے قاعدگی نہیں۔ مرضی سے اس مفہوم میں آزاد ہے کہ یہ ایک کردار کا تاثر ہے اور کردار سے باہر کا کوئی فاعل اس کا تعین نہیں کرتا۔ چنانچہ آزادی کا

مطلب خود مختاری ہے نہ کہ لاتعینیت۔

آزادی اور جبریت

میکنزی نے درست طور پر کہا ہے کہ آزادی اور جبریت دونوں ہی اخلاقیات اور مذہب کے لیے لازمی ہیں۔ کانٹ کے مطابق جب متضاد خواہشات میں سے آزادانہ انتخاب کیا جائے تو مخصوص اقدام اخلاقی ہوتا ہے۔ انسانی خواہشات میں سے آزادانہ انتخاب کیا جائے تو مخصوص اقدام اخلاقی ہوتا ہے۔ انسانی خواہشات کو سابق خواہشات' پختہ عادات' روایات' رسوم اور تربیت متعین کرتی ہے۔ انسان کا کردار اس کی وراثت' سماجی ماحول' گردو پیش اور اعمال سے متعین ہوتا ہے۔

انسان فطرت سے بالاتر نہیں' بلکہ محض اس کی پیداوار ہے۔ فطرت میں کوئی رخنہ اور ایسا مقام نہیں جہاں اس کے قوانین عمل کرنا چھوڑ دیں۔ ہر چیز ان قوانین کی مطابقت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ بالکل اسی طریقے سے بچہ قانون فطرت کے مطابق میں کھاتا' سوتا' نشوونما پاتا' سوچتا اور انتخاب کرتا ہے۔ چنانچہ بطور جبریت جانے والا نظریہ نہ صرف سائنس دانوں' بلکہ اخلاقیات دانوں' ماہرین سماجیات اور حتیٰ کہ اہل دین کے درمیان بھی بہت زیادہ مقبول ہے۔ جبریت کسی بھی اعتبار سے فضائل یا اخلاق یا مذہب کی دافع نہیں۔ یہ اچھے طرز عمل' اچھی شہریت اور انسانی ذمہ داری سے ہم آہنگ ہے۔ برائی برائی ہی رہتی ہے۔ اور اچھائی اچھائی' اور اسی طرح ہمیں اپنے طرز عمل کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ کسی ملزم کا جج کے سامنے جانا اور یہ کہنا بیکار ہے ''مجھے سزا نہ دیں' میں اپنے اعمال کے لیے ذمہ دار نہیں ان کا تعین قوانین فطرت کرتے ہیں۔ میری مرضی کے اقدامات میری اپنی قوت محرکہ سے متعین ہوتے ہیں۔''

اگر ہمارے اعمال سابق انتخابات' اشتہاؤں اور جذبات' عادات اور روایات کے ذریعہ متعین ہوتے ہیں تو یہ سب چیزیں ہمارا ہی حصہ ہیں' اس لیے ہماری جبریت بھی خودمختاری ہے۔ خودمختاری آزادی ہے نہ کہ جبریت۔

جبریت کے حق میں دلائل

(۱) استقرائی دلیل

جبریت سائنسی مسلک کی حیثیت میں ایک نکتہ نظر ہے کہ انسان سمیت فطرت کی تمام قلمرو علت اور معلول کی مسلسل زنجیر میں حصہ دار ہے۔ دنیا میں تمام واقعات پچھلے واقعات کے ذریعہ میں پوری طرح واضح ہوتے ہیں۔ مختلف فطری مظاہر میں علت و معلول کے تعلقات دریافت کرنا سائنس اور منطق کا مقصد ہے۔ اسی مطابقت سے ہم جبریت کے طور پر انسان کے رضا کارانہ افعال' اس کی خواہشات اور تحریکوں وغیرہ کی علت دریافت کرسکتے ہیں۔ چنانچہ تمام افعال کو جبریتی سمجھا جاتا ہے۔

(۲) استخراجی دلیل

استخراجی دلیل کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے کہ تمام افعال جبریت کی وجہ سے ہیں۔ اگر یہ دنیا کے تمام علتی مظاہر پر قابل اطلاق ہے تو کوئی بھی مخصوص فعل جبریت کی تقدمیت کے ذریعہ قابل پیش گوئی ہے۔

(۳) علمیاتی دلیل

کانٹ کے مطابق موضوع علم بن سکنے والی کوئی بھی شے بذات خود علم کے عوامل پر حکمران تمام قوانین کی تابع ہے۔ ایک علم اور دوسرے علم کے درمیان ایک تعلق موجود ہے۔ چونکہ سبھی کو علم کہا جاتا ہے' اس لیے ہمیں اسی قسم کے ذہنی عوامل کو لاگو کرنا ہوگا۔ چنانچہ کسی بھی علم کی علت لازماً ہوتی ہے۔ اور ہم کافی بہتر طور پر فرض کرسکتے ہیں کہ علت جبریت کے عمل کے سوا کچھ نہیں۔

(۴) مذہبی دلیل

یہ پہلے سے متعین شدہ مقدر کا مذہبی عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ الوہی فرمان کے ذریعہ ہر شخص کی تقدیر لکھی جا چکی ہے۔ اگر خدا قادر مطلق اور علیم وخبیر ہے تو لازماً وہ ہی ان

چیزوں کا تعین کرتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ فطرت اور انسانی رویہ بشمول انسانی ارادہ' میں واقعات کا تعین خدا کی حاکمیت کرتی ہے۔

جبریت پر تنقید

(۱) استقرائی دلیل کا تصور اپنے کردار میں استدلالی اور منطقی ہے۔کائنات علت اور معلول کا منظم مجموعہ ہے۔علتی جبریت یکسانیت سے عاری مخصوص مظاہر کی توضیح کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔یہ جبریت علتی عمل میں ایک شرط ہوسکتی ہے لیکن تمام افعال کی علت نہیں بن سکتی۔اپنے احساس کے مختلف النوع شعبوں کی وضاحت کرنے کے لیے اس جبریت کو ہمہ گیر طور پر لاگو نہیں کرنا چاہیے۔

(۲) استخراجی دلیل کی رو سے ہمارا جبریت کا مفروضہ ہمہ گیر طور پر قابل قبول نہیں ہوسکتا۔مثالوں کا مشاہدہ کیے بغیر عمومی بیان جاری کر دینا ممکن نہیں مثالین دیکھنے کی صورت میں ہمیں غور کرنا ہوگا کہ وہ علتی اعتبار سے مربوط ہیں یا نہیں۔جبریت علت نہیں ہوسکتا ہے ہم وجودیت کا جوہر ہو لیکن مظاہر کی ہمہ گیر علت نہیں۔

(۳) علمیاتی دلیل پر بھی بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں' کیونکہ علم کا عمل کسی ایک مخصوص قانون کا تابع نہیں ہوسکتا۔صوفی یا عام آدمی یقین کرسکتا ہے کہ سارا علم ایک جیسا ہے اور جبریت کا عمل اس کی وجہ ہے۔

(۴) الہیات دانوں کے مذہبی دلائل کی مذمت الحاد پرستوں اور منطقی ایجابیت پسندوں نے کی ہے۔اسی طرح تجربیت پسند نظریہ جبریت کو ہر شے کی علت کے طور پر دیکھتے ہیں۔خدا کے وجود کا سوال ایک متضاد الرائے مسئلہ ہے' اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر چیز کی علت خدا ہے' اور وہی چیز کا تعین کرتا ہے۔

لاتعینیت اور آزادی

آزادی کا مطلب لاتعینیت (Indeterminism) نہیں۔لاتعینیت پسندوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی ارادہ مکمل طور پر خودمختار ہے۔آزادی خودمختار

اور خود تعیناتی اقدام ہے۔ لاتعینیت میں درحقیقت انسانی اعمال کے درمیان ایک استدلالی تعلق کا استرداد ہے۔ یہ انجام کار ہر شے کو اتفاق پر چھوڑ دیتا ہے۔ آزادی سے مراد بیرون سے پابندی یا ذات کے علاوہ اور کچھ نہ ہونا ہے۔ آزادی کو انتخاب کی من مانی تک ہی محدود نہیں کرنا چاہیے۔ یہ امر حقیقت اس قسم کے ناقابل پڑتال انداز میں عمل کرنا آزادی نہیں۔ یہ شعور کی برتر حالت ہے۔ چنانچہ آزادی کا مطلب خود تعینیت ہے نہ کہ لاتعینیت۔

ولیم جیمس آزاد مرضی کے نظریہ کا ایک قابل شارح تھا۔ اس نے اسے ''لاتعینیت'' کا نام دیا۔ جیمس کا کہنا ہے کہ لاتعینیت یہ نکتہ نظر ہے کہ کائنات کے حصے اپنے اندر ''ڈھیلے پن'' کی کافی مقدار رکھتے ہیں یعنی تمام چیزیں علتی طور پر مربوط نہیں اور چیزوں کی فطرت میں ای حقیقی تکثیریت (Pluralism) موجود ہے۔

نتیجہ بحث

تجربیت اور مابعد الطبیعیات کے نکتہ نظر سے پابندی اور آزادی زندگی کے مسائل ہیں نہ صرف مغربی فلسفیوں نے بلکہ مذاہب 'ہندومت' عیسائیت اور اسلام کے تمام اہم محققین نے اپنے اپنے صحائف میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ مسیح ساری روح کو تاریکی سے روشنی میں' اور پابندی سے آزادی کی جانب لا سکتا ہے۔ وہ خدا کا بیٹا ہونے کی وجہ سے یہ معجزہ دکھا سکتا ہے کیونکہ وہ افلاک میں موجود باپ الوہی اور کامل زندگی میں شریک ہے۔

اسلام میں آزادی یا مکتی کو ''نجات'' کہا جاتا ہے۔ گناہگار زندگی سے منہ موڑنا اور خدا کی مرضی کے مطابق چلنا نجات ہے۔ گناہوں سے نجات پانے کا بنیادی آلہ کار اچھے اور نیک اعمال ہیں۔

پیدا ہونا اور پھر مرنا پابندی ہے۔ زماں' مکاں اور علیت کے جال میں صرف پابندی موجود ہے۔ ہر کوئی شخص اپنی سوچ' قول اور فعل کا پابند ہے۔ ہماری سوچ' قول' علم اور

عقل کی رسائی مایا سے باہر نہیں ۔یہی مایا پابندی ہے ۔ ہماری لاعلمی ٗفریب نظر ٗاور سراب مایا کے سوا کچھ نہیں ۔یہی مایا پابندی ہے ۔ ہماری لاعلمی ٗفریب نظر اور سراب مایا کے سوا کچھ نہیں ۔ مایا ہی کی وجہ سے ہر چیز حقیقی نظر آتی ہے ۔لیکن در حقیقت یہ حقیقی نہیں ۔ مایا اور پابندی میں کوئی حقیقت نہیں ۔

بن جانے اور ہو جانے کی ایک آزادی پائی جاتی ہے ۔سیاسی ٗ معاشی ٗ سماجی اور تنظیمی آزادی وغیرہ سب بن جانے کی آزادی کا حصہ ہیں ۔لیکن نفسی آزادی ''ہونے'' کی ہے جس پر دیگر تمام چیزوں کے موثر پن کا انحصار ہے ۔بطور شخص آزاد ہونے تک باقی تمام آزادیاں اس کے کوئی معنی نہیں رکھتیں ۔

ہم اپنی عادات ٗ خواہشات ٗجذبات ٗ جسم اور ذہن کے غلام ہیں ۔ہم اپنی زندگی کی شعوری اور غیر شعوری پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں ۔قدیم ہندوستانی نظریہ کے مطابق پابند روح ''جیوا'' کہلاتی ہے ۔جیوا کا مقصد آزادی کی حالت میں زندہ رہنا ہے ٗ اور ساری تخلیق جلد یا بدیر نجات پالے گی ۔لیکن نیک اعمال والے جیوا برے اعمال والے جیوا کی نسبت جلد نجات حاصل کر سکتے ہیں ۔اور فوری نجات حاصل کرنے کی خاطر جیوا سراب یا مایا کی دنیا کو چھوڑنے اور حقیقی دنیا کو اپنانے کے لیے کوشاں ہیں ۔

بنی نوع انسان کی بہت بڑی تعداد مادی چیزوں پر مسرور ہے ۔اور اس کا خیال ہے کہ وہ آزادی کا مزہ اٹھا رہے ہیں لیکن در حقیقت یہ پابندی اور غلامی ہے ۔خواہشات اور پابندیوں کا شکار تقریباً حیوان ہے ۔اور خواہشات اور پابندیوں سے عاری شخص خدا کے انتہائی قریب ۔

☆☆☆

٦ :: مسئلہ شر

خیر اور شر کا مسئلہ عہد در عہد فلسفیوں اور مشرقی و مغربی مذہبی اساتذہ نے بحث کا موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے متعدد اور مختلف حل پیش کیے ہیں۔ خیر اور شر کی دو مخالف قوتیں باہم برسرپیکار ہیں۔ ہم کائنات میں ہر کہیں یہ تصادم دیکھتے ہیں' اپنے اندر بھی اور باہر بھی۔ دونوں قوتیں آپس میں اس قدر مدغم ہیں کہ انہیں الگ الگ کرنا ناممکن ہے۔ انسانی زندگی خیر اور شر کا ملغوبہ ہے۔ اچھائی اور برائی باہم مربوط حقیقتیں ہیں۔ چنانچہ اچھائی کا کوئی تصور قائم بے بغیر برائی کو علیحدہ حیثیت میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا ایک ناممکن العمل معاملہ ہے۔

شر کیا ہے؟

افلاطون کے مطابق پاکیزہ، غیر متغیر تصورات اور خیالات نیکی یا خیر کی دنیا ہے جس کی دنیا تبدیلی کی دنیا شر ہے۔

سوفسطائیوں کا کہنا تھا کہ "انسان اپنے آپ کا معیار ہے" اور اس لیے ہر انسان خیر اور شر کا اپنا ضابطہ بنا سکتا ہے۔ ایسا نظریہ جس پر زندگی میں عمل کرنا بے شک نہایت خطرناک ہے۔

فلپ کے خیال میں دیوتا کامل پاکیزگی اور تمام اچھائی کا ماخذ ہوتا ہے۔ مادہ تمام برائی کا منبع تھا۔ سپنوزا کہتا ہے کہ برائیوں کی وجہ سے ہمارا چیزوں کو دیکھنے کا تنگ انداز ہے' کہ برائی اس لیے ایسی نظر آتی ہے کیونکہ ہم اپنے مخصوص مفاد کے حوالے سے چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم اپنے انداز نظر کو وسعت دے لیں اور چیزوں کو خدا کے انداز نظر سے دیکھنا سیکھ لیں تو یہ بے معنویت غائب ہو جاتی ہے۔ ہیگل کے مطابق برائیاں محض وہ غیر استدلالی عناصر ہیں جو اچھے یا استدلالی بننے پر مائل ہوتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت جو استدلالی ہے کے لیے یہ دیکھنا لازمی ہے کہ غیر استدلالیت یا برائی

استدلالی ہے۔ سپنوزا اور ہیگل دونوں نے عملی طور پر برائی کی حقیقت سے انکار کیا۔

لیبنیز کے خیال میں برائی ان نقائص کی وجہ سے ہے جو کائنات کے محدود عناصر کی تعمیر میں خلقی ہیں۔ بوسانکوے (Bosanquet) کہتا ہے ''برائی میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اچھائی میں جذب نہ ہوسکتی ہو۔ یہ بھی اسی منبع سے پھوٹتی ہے جس سے اچھائی اور نیکی''۔

فلسفہ ویدانت کہتا ہے کہ خدا یا وجود مطلق برائی سے غیر متاثر اور نسبتی اچھائی سے بالاتر ہے جو برائی سے متلازم ہے۔ نسبتی اچھائی اور نسبتی برائی دونوں مشترکہ ماخذ کی حامل ہیں۔ وہ ایک ہی کائناتی قوت کے دورخی اظہار ہیں۔

عیسائیت میں اچھائی اور برائی دونوں بہت نمایاں ملتے ہیں۔ خدا نے انسان کو اچھا بنایا' لیک وہ گوشت میں بدل گیا اور گناہ و برائی کے تابع ہوگیا۔ مرد اول آدم کا گناہ سب انسانوں......اس کی اولادوں میں منتقل ہوتا گیا۔ برائی اور گناہ کی تمام قوتیں شیطان کی شخصیت بن گئیں۔ چنانچہ' روایتی عیسائیت میں دوہستیاں متحرک نظر آتی ہیں......خدا' تمام اچھائی کی قوت' اور شیطان' برائی کا ماخذ۔

مسئلہ شر

یقین کیا جاتا ہے کہ دنیا خدا کی تخلیق کردہ ہے۔ یہ سوال پوچھنا قدرتی امر ہے کہ اگر دنیا ایک رحیم وشفیق قوت نے تخلیق کی تھی تو اس میں برائی کیسے داخل ہوگئی۔ اگر شر دنیا سے پہلے ہی موجود تھا تو پھر خدا اس کی موجودگی سے محدود ہے۔ اگر خدا عقیل وبصیر اور فیض رساں ہے تو اس قسم کا خدا اپنی تخلیق میں جسمانی اور اخلاقی دونوں برائیوں کو واقع ہونے کی اجازت کیسے دیتا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ اگرچہ وہ قطعی طور پر خیر اور دانا ہے' تاہم اس کے پاس شر کی تدارکی قوتیں محدود ہیں۔ یو ہوسکتا ہے کہ کہ وہ قادر مطلق' دانائے مطلق' اور خیر مطلق' تاہم اس کی اپنی دنیا میں برائیوں کی تشکیل صرف بنی نوع انسان کو تربیت دین کی خاطر کی تاکہ وہ انتباہ کے ذریعہ اخلاقی طور پر نیک بنیں۔

اگر خدا لامحدود طور پر نیک ہے تو ہم تمام تکلیف اور شر' تمام گناہ اور دکھ اور ناامیدیوں کی وضاحت کیسے کریں جو ہر کہیں عیاں ہیں؟

شر کی مختلف صورتیں

شر کی تین مختلف صورتیں ہیں (۱) مابعد الطبعیاتی برائیں (۲) طبعی یا ذہنی برائیں (۳) اخلاقی برائیاں۔

مابعد الطبیعیاتی برائیاں

مابعد الطبیعیاتی برائی فطری برائی یا شر کو مابعد الطبعیاتی برائی کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی ارادے سے آزاد ہے۔ اس کا انحصار قوانین فطرت کے کاروبار پر ہے زلزلے آتش فشاں' قحط' خشک سالی' گردابی طوفان' گردباد اور سیلاب وغیرہ فطری آفات ہیں جنہیں مابعد الطبیعیاتی برائیاں خیال کیا جاتا ہے۔ وہ نوع انسانی میں تکلیف اور پریشانی پیدا کرتی ہیں۔ یہ تمام برائیاں ہمارے اختیار سے ماورا ہیں۔ تاہم سائنس دان اب ان آفات سے بچنے کے لیے تحقیقاتی آلات تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

طبعی یا ذہنی برائی

تمام طبعی اور ذہنی تکلیف اور دکھ برائی کی اس صورت میں شامل ہیں۔ انسان کو تکلیف اور درس سہنا پڑتا ہے۔ گوشت و خون سے بنا انسان طبعی اور ذہنی عناصر کے باعث لازماً تکلیف اٹھاتاہ۔ جسمانی بیماریاں ارو انحطاط ہمارے جسم سے معدوم نہیں ہو سکتا۔ ذہنی پریشانی' رنج' ہیجان' تناؤ' غصہ وغیرہ انسان میں ذہنی برائی پیدا کرتے ہیں۔ سائنس طبعی اور ذہنی بیماریوں کی روک تھام کر رہی ہے۔ جسمانی برائیاں اب تکلیف دہ نہیں ہیں اور خوش بختی و سکھ کے سرچشمے بن گئی ہیں۔

مہم جوئی (Adventure) کے جدید جذبے نے انسانی تکالیف کی ناگواریت کو بلد کر انہیں مابعد الطبیعیاتی اور طبعی برائیوں کے خلاف قوت محرکہ اور ایکشن بنا دیا ہے۔ اب زندگی کا ناقابل بسر نہیں سمجھا جاتا۔ اور ایک طاقت ور امید پرتی جدید انسان کی

زندگی کی رہنمائی کرتی ہے۔

اخلاقی برائی

اخلاقی برائیاں بھی کم حقیقی نہیں اور سماجی ارتقاء کی موجودہ حالت میں کہیں زیادہ باریک بین مطالعہ کا تقاضا کرتی ہیں۔ اخلاقی برائیاں انسان کی آزاد مرضی کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ یہ اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی پر مشتمل ہیں گناہ اور عیاری وغیرہ اخلاقی برائیاں ہیں۔ اخلاقی برائی کا مسئلہ انسانوں کا پیدا کردہ ہے اور اس لیے اسے انسانوں کو ہی حل کرنا ہے۔ اخلاقی کاملیت کی جانب بڑھنا ایک خودکار عمل نہیں۔

اخلاقی زندگی ایک جدوجہد زندگی ہے۔ یہ حقیقی اور خیالی خواہش اور فرض اچھائی اور برائی کے مابین جدوجہد ہے انسان اپنے کردار سے پیدا ہونے والے ہر عمل میں اور ہر عمل کے ذریعہ اپنی اخلاقی فطرت کا احساس کرتا ہے۔ اگر خطاواری کا کوئی امکان موجود نہ ہوتا تو انسان کی کوئی اخلاقی زندگی نہ ہوتی۔

مسئلے کا حل

مسئلہ شر حل کرنے کی خاطر ہمیں فسلفہ کے دو مکاتب یعنی یاسیت پرتی اور امید پرتی پر غور کرنا ہوگا۔ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

یاسیت پرتی

یہ ایک فلسفیانہ عقیدہ ہے جس میں زندگی بنیادی طور پر دکھ درد اور شر ہے۔ یاتی پرست ہمیشہ دنیا کا تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے جرمن فلسفی آرتھر شوپنہاور نے یاسیت پرتی کے حق میں پر زور خیالات پیش کیے۔ اس فلسفہ کے مطابق یہ دنیا ہر ممکن حد تک بدترین دنیا ہے۔ زندگی ایک ابدی کشمکش ہے غیر محسوس کے لیے خواہش۔ چنانچہ زندگی غیر تسکین شدہ تمنا تکلیف اور اذیت سے بھرپور ہے۔ یہ ہر ممکن حد تک بدترین دنیا ہے کیونکہ ہم پر ٹوٹنے والی بد اندیش قوتیں اگر اور بھی زیادہ بری ہوتیں تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

ہم یاسیت پرستی کو ایک بیماری خیال کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے تشخیص اور علاج تجویز کیا گیا لیبنیز کا خیال تھا کہ ہماری دنیا خدا کی جانب سے منصوبہ بندی کی ہوئی بہترین ممکن دنیا ہے۔ لیکن شر تخلیق شدہ موجودات کی فطرت سے ناقابل علیحدگی ہے۔ محدود چیزیں ہمیشہ ناقص ہوتی ہیں۔ لیکن بری چیزیں انجام کار اچھائی پر مائل ہوتی ہیں۔ سوامی دیوکانند نے کہا ہے کہ ہماری زندگی مین یاسیت پرستی یا لفظ ناممکن موجود نہیں۔ چنانچہ اٹھو جاگو اور منزل پر پہنچنے تک نہ رکو! نیکی اور بدی کے حوالے سے انہوں نے واضح الفاظ میں کہا:

> ''معروضی معاشرہ ہمیشہ نیکی اور بدی کا ملغوبہ ہوگا۔ معروضی زندگی ہمیشہ اپنے سائے موت کے ساتھ چلے گی۔ ہماری اپنی زندگیوں کا دارومدار دوسروں...... پودوں، جانوروں یا جرثوموں کی اموات پر ہے! دنیا کی ترقی کا مطلب یادہ لطف کے ساتھ ساتھ زیادہ تکلیف دہ بھی ہے۔ زندگی اور موت، نیکی اور بدی علم اور لاعلمی کا یہ ملغوبہ ہی مایایا مظہر کائنات کہلاتا ہے۔ آپ مسرت کی جستجو میں اس جات کے اندر ابدیت کی جانب جاتے ہیں...... آپ کو زیادہ مسرت اور زیادہ بدی بھی ملتی ہے...... نیکی کی خواہش کرنا اور بدی سے چھٹکارا چاہنا حماقت ہے''۔

بدھ مت ایک یاسیت پرستانہ عقیدہ پیش کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بصیرت اور آنند حاصل کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ بدھ مت کا پہلا اعلیٰ سچ ''دکھ ہے۔ زندگی دکھ ہے'' پیدائش کا دکھ ہے انحطاط دکھ ہے، بیماری دکھ ہے، مسرت چھن جانا دکھ انگیز ہے۔ اور کوئی بھی غیر تسکین شدہ تمنا بھی دکھ ہے۔ گوتم بدھ کہتاہ کہ زندگی تکلیف اور دکھ سے بھرپور ہے۔ بدھ محض زندگی کی بے وقعتی کا پرچار نہیں کرتا بلکہ وہ برائی کے خلاف بغاوت کرنے اور اعلیٰ کیفیت کی زندگی حاصل کرنے کو کہتا ہے۔

دکھ سے نجات بدھ کا تیسرا اعلیٰ سچ ہے۔ دکھ کی ذمہ دار وجوہات کے تدارک کے ذریعہ اسے بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ دکھ کی یہ مکمل نیستی ''نروان'' کی حالت کہلاتی ہے۔ یہ دکھ انحطاط اور فنا کی مکمل نیستی ہے۔ بدھ کے مطابق ہم اسی زندگی میں نروان حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنے چوتھے اعلیٰ سچ میں دکھ سے نجات کے لیے ایک آٹھ نکاتی راہ مہیا کی ہے۔

کچھ لوگ پرمسرت رخ کے مقابلہ میں المیہ رخ کی جانب زیادہ مائل ہوتے ہیں' اور وہ طربیہ سے زیادہ المیوں کو پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ شیلے کے ہم خیال ہیں۔ ''ہماری دلکش ترین نغمات وہ ہیں جو اداس ترین خیالات پیش کرتے ہیں''۔

امید پرستی

امید پرستی کو روشن و درخشاں اور لطف انگیز بناتی ہے۔ یہ زندگی اور وجود کی جانب ایک مثبت انداز فکر ہے امید پرستی جو یاسیت پرستی کے عین الٹ ہے خوشگوار تجربے کو بلند ترین نکتہ نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ مسئلہ شر صرف بزدلانہ زندگی کے حلقہ کے اندر ابھر سکتا ہے۔ کائنات حقیقت میں کامل طور پر اچھی ہے۔ ہر چیز اچھی ہے' جیسا کہ آگسٹائن نے کہا۔ سپنوزا کا کہنا تھا کہ ہر چیز خیر ہے خیر اور شر خالصتا سوچنے کے دو موضوعی تصورات ہیں۔ اور یہ حقیقت مطلق کی توثیق نہیں کر سکتے۔ جو کامل ہے۔ سپنوزا کے مطابق برائیوں کا سبب ہمارا تنگ انداز فکر ہے کہ برائیاں ہمیں اس لیے ایسی نظر آتی ہیں کیونکہ ہم مخصوص مفاد کے حوالے سے انہیں دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنی نظر کو وسعت دیں تو یہ عدم ہو جاتی ہیں۔ ہیگل کی رائے میں بھی برائی غیر حقیقی ہے اور جزوی کتہ نظر سے موجود ہوتی ہے لیکن مکمل احاطہ کرنے والے نکتہ نظر کو اپنانے سے غائب ہو جاتی ہے۔ لیبنیز کے خیال میں جس دنیا میں ہم زندہ ہیں یہ تمام ممکنا دنیاؤں میں سے بہترین ہے''۔

انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں حاصل کی جانے والی عظیم کامیابیوں کا تعلق

کائنات کے امید پرستانہ نکتہ نظر کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ امید و بیم تخلیق و تعمیر کی مہمیز ہے' جبکہ نا امیدی اور ڈپریشن بے عملی اور تباہی کا ماخذ ہیں۔

برائیاں انجام کار اچھائی کی جانب مائل ہوتی ہیں۔ بیشتر برائیاں کہیں زیادہ اچھائی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ کائنات بحیثیت مجموعی ایک وسیع فنکارانہ ڈھانچہ ہے۔ جس میں برائیاں اچھائی کی ماتحت ہیں۔ اگر کوئی نقص موجود نہ ہوتا تو کاملیت کاملیت نہ ہوتی۔ کائنات منطقی ہے اور ایک ایسا عمل جس میں تمام اختلافات انجام کار ہم آہنگ بن جاتے ہیں برائی کمتر اچھائی ہے۔ فرد کی فطرت محدود ہے لامحدود ہے۔ چنانچہ اختلاف یا نقص موجود ہے۔ یہ عدم اتفاق ترقی کی کنجی ہے۔ اور جب ہم آہنگی حاصل ہو جائے تو عدم اتفاق یا برائی غائب ہو جاتی ہے۔

اخلاقی برائی یا گناہ کوئی قبال تو جیہ مقام نہیں رکھتا اور یہ اخلاقی فضیلت اور کاملیت کی جانب فرد کی ترقی کا ایک قدم ہے۔ بوسانکوے (Bosanquet) اپنی کتاب ''دنیا اور فرد'' میں کہتا ہے کہ ''برائی میں ایسا کچھ نہیں جسے بھلائی میں جذب نہ کیا جا سکتا ہو اور وہ اس میں شریک نہ ہو۔ برائی کا سرچشمہ بھی وہی ہے جو نیکی کا ہے''۔ گناہ یا اخلاقی برائی درحقیقت اپنے آپ میں مثبت کردار کی حامل ہے۔ یہ حصول نیکی کے لیے وسیلہ بن سکتی ہے' لیکن اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وحدت پرستی

موحدانہ نظر میں خدا تمام موجودات کی حقیقت مطلق ہے۔ وہ محدود اور عارضی اشیاء کے نقائص سے بگاڑ کا شکار نہیں ہوتا اور غیر مشروط' لامحدود اور خود علتی یا خود موجود ہے۔ چونکہ خدا لامحدود اور غیر مشروط ہے اس لیے وہ واحد اور ایک حقیقت ہے۔ توحیدی فلسفہ کی نظر میں مطلق اعلیٰ ترین ضابطہ ہے۔ سپنوزا کا جوہر یا ہیگل کا مطلق فلسفیانہ خیال آرائی کا نکتہ عروج ہے۔ سی ای ایم جوڈ کے مطابق ''برائی نیکی کی لازمی توصیف ہے''۔ بھگوت گیتا میں کہا گیا ہے کہ ثنویت یا دوئی کی دنیا کی اچھائی اور برائی غیر حقیقی ہے' یہ

الفاظ کے ذریعہ کہی جاتی ہے اور اس لیے اس کی وجود صرف ذہن میں ہے۔ شنکر کا فلسفہ ویدانت کہتا ہے کہ مطلق یا برہما نفس سے عینیت رکھتا ہے۔ دونوں متشابہ ہیں۔ اسی طرح پیدائش اور موت مختلف نہیں اور اچھائی اور برائی غیر متضاد ہیں۔ ویدانت فلسفیوں کے مطابق اچھائی اور برائی کے درمیان فرق نوعیت کا نہیں طریق عمل کا ہے جیسے روشنی اور تاریکی کے درمیان فرق جو ایک ہی شے کے دو پہلو ہیں۔

نتیجہ بحث

یاسیت پرست مفکرین برائی کو ایک مثبت حقیقت بناتے ہیں اور برائی کو منفی۔ انہوں نے تخریب و انتشار موت اور تکلیف کو کائنات کا مقصد بنایا اور اچھائی کے وجود سے انکار کیا وہ کہتے ہیں کہ دکھ اور تکلیف ہمارے وجود کی شرائط ہیں: کہ مسرت اور خوشی حادثاتی طور پر ملتی ہیں۔ ان یاسیت پرستوں کے مطابق زندگی جینے کے قابل نہیں انہیں زندگی میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔ وہ ہر طرف برائی ہی برائی ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں اس نظریے پر یقین نہیں کہ خالق جو رحیم منصف اور بھلائی ہے نے دکھ تکلیف رنج والم اور برائی کی یہ دنیا تخلیق کی ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ اسے کس نے تخلیق کیا ہیل۔ چنانچہ یاسیت پرستانہ توضیح ایک انتہا تک لے جاتی ہے اور استدلالی ذہن کو مطمئن نہیں کرتی۔ بہت سوں نے یاسیت پرستانہ طبیعت کو ایک ذہنی بیماری خیال کیا ہے۔

ایسے امید پرست مفکرین موجود ہیں جو ایک منصف و عادل رحیم اور اچھے خدا کی تخلیق میں برائی کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سب کچھ اچھا ہے۔ اور کوئی برائی موجود نہیں ہوسکتی۔ وہ ہر کہیں اور ہر کام میں اچھائی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تمام تکالیف احکام اور سختیوں کو اپنی چھائی کے لیے سمجھتے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی دھکا لگتا ہے تو اسی میں ہماری بھلا ہے۔ چنانچہ ہر چیز ہماری بھلائی کے لیے ہے اور ہونی چاہیے۔ کیونکہ تخلیق کی فطرت خلقی طور پر اچھی ہے۔ وہ تخلیق کی برائی سے انکار اور وضاحت کرتے ہیں کہ اچھائی ایک مثبت (ایجابی) حقیقت ہے۔ اور یہ کہ جسے ہم

برائی کہتے ہیں وہ محض اچھائی کی نفی ہے۔اچھائی دنیا میں ہمیشہ سے غالب ہے تاہم ہم اسے سب کچھ میں موجودنہیں دیکھ پاتے۔لہٰذا برائی کی وجہ تلاش کرنے کی بجائے وہ اس کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔اس قسم کی امید پرستی ایک اور انتہا پسندی ہے۔

چنانچہ اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کی وجہ سے ایک بہتر وضاحت درکار ہے لیکن اگر امید پرست ہر چیز میں اچھائی دیکھنے اور یہ کہنے کے قابل توجیہ ہیں کہ خدا نے یہ نید اہمارے مسرت اور خوشی کے لیے تخلیق کی ہے تو یاسیت پرست بھی ہر چیز میں برائی دیکھنے اور یہ کہنے میں اتنے ہی حق بجانب ہیں کہ خدا نے یہ دنیا کروڑوں افراد کی دکھ اور تکلیف کے لیے تخلیق کی ہے۔صحیح توضیح امید پرستی میں ہے اور نہ یاسیت پرستی میں یہ دونوں انتہائیں ہیں۔

ہندوستانی کے وحدت پرست فلسفیوں کے مطابق اضافیت یا نسبت کی اس دنیا میں کوئی قطعی طور پا اچھی یا قطعی طور پر بری چیز ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ہم اچھائی اور برائی سزا اور جزا کے درمیان کوئی حتمی خط امتیاز نہیں کھینچ سکتے۔خلقی طور پر وحدت پرستانہ ویدانت کا فلسفہ کہتا ہے۔''اچھے یا برے محرکات کے تحت کیا ہوا کوئی بھی فعل اپنے مخالف سے ڈھکا ہوتا ہے جیسے آگ دھوئیں سے''۔

عہدنامہ جدید کے مطابق تمام بیماری دکھ' تکلیف' رنج' جرم' گناہ' اور سب دیگر برائیاں شیطان کی کارگزاری ہیں۔روایتی عیسائیت میں دو ہستیاں فاعل نظر آتی ہیں۔ ......ایک خدا جو تمام اچھائی کی قوت ہے۔دوسری شیطان جو تمام برائی کا منبع ہے عقیدہ ہے کہ مسیح نے شیطان کی تحریص میں مدافعت کرکے اسے مفتوح کرلیا تھا۔

جزا اور سزا کے علاوہ نیکی اور بدی کے بھی بالکل یہی خیالات مسلمانوں میں بھی موجود ہیں جو عہدنامہ عتیق کو بھی اتنا ہی مانتے ہیں جتنا کہ عیسائی اور طبرانی۔تاہم عبرانی پیغمبروں کا عقیدہ تھا کہ خدا اچھائی اور برائی دونوں کا خالق ہے۔

مسئلہ شر کے بارے میں شری رام کرشن کا ایک قول بتاتے ہوئے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بجلی جب روشنی دیتی صنعت میں مدد کرتی ' تکلیف دور کرتی ہے تو یہ اچھی ہے۔ لیکن جب یہ کسی انسان کو کرنٹ سے بری طرح جلا ڈالتی ہے تو بری بن جاتی ہے۔ لہٰذا بجلی اچھی ہے اور نہ بری لیکن اس کے اثرات کو پیدا ہونے والے نتائج کے اعتبار سے اچھا یا برا کہا جاتا ہے۔ اگر ہم سمجھ جائیں کہ بجلی مثبت ہے نہ منفی' بلکہ ایک میگنٹ کے ذریعہ آشکار کیے جانے پر مثبت یا منفی کے طور پر ظاہر ہوتی ہے تو ہمیں سمجھ آ جاتی ہے۔ کہ قوانین فطرت ہمیں صرف تبھی اچھے یا برے لگتے ہیں اگر ہم تسلیم کر لیں کہ ابدی قوت یا الوہی منشا ءصرف ہمارے ذہنوں اور زندگیوں کی نسبت سے اچھی یا بری ظاہر ہوتی ہیں تو صرف تبھی ہم شری رام کرشن کی طرح کہہ سکتے ہیں۔ ''خدا نیکی یا بدی تخلیق نہیں کرتا نہ ہی وہ کسی شخص کی نیکی یا گناہ لیتا ہے۔ وہ بے ایمان کو سزا یا نیک کو انعام نہیں دیتا۔ ہماری فہم لاعلمی کے بادل میں ملفوف اور ہمارے غلط فہم ہونے کی وجہ سے ہم اپنی ناقص سمجھ کے حوالے لیں خیال کرتے ہیں کہ خدا اچھائی یا برائی پیدا کرتا ہے۔ کہ اس کی تخلیق اچھی یا بری ہے' کہ وہ سزا یا جزا دیتا ہے''۔

☆☆☆

۷ :: نظریہ عمل

"بے لوث ہو کر عمل کرو۔ تمہارے عمل کا پھل تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ نہ ہم تم عمل چھوڑو"۔ (بھگوت گیتا)۔

نظریہ عمل فلسفہ اور مذہب میں ایک موضوع ہے قدیم سنسکرت کتب میں بھی لفظ کرم بمعنی عمل آیا ہے۔ یہ "کر" (کرنا) سے مشتق ہے۔ چنانچہ کوئی بھی طبعی یا ذہنی کام عمل کہلاتا ہے۔ کوئی بھی شخص لحظہ بھر کے لیے بھی بے عمل نہیں رہ سکتا۔ چونکہ ہماری زندگی میں کام ناگزیر ہے۔ اس لیے ہمیں پھل سے بے غرض ہو کر کام کرنا چاہیے۔ یہی راہ عمل ہمیں خدا تک پہنچاتی ہے۔

ہندو مذہب کے مطابق ہم سب پہلے جنم لے چکے ہیں۔ اور ہماری موجودہ زندگی کی حالت گزشتہ زندگیوں کا براہ راست نتیجہ ہے۔ ہم سب انسانوں کے درمیان نابرابریاں اور اونچ نیچ محض علت اور معلول ہیں یعنی جو کچھ ماضی میں بویا تھا اب حال میں کاٹ رہے ہیں ہماری بنیادی روح جنم جنم چلتی ہے۔ یہ بار بار جنم لیتی ہے اور اگلی زندگی کی حالت اختیار کرتی ہے۔

انسان خواہشات کی ایک گٹھڑی سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان کے عمل ہی میں اس کی حقیقت ہے۔ افعال کا قانون واحد حقیقت ہے جس کے مطابق انسان اپنے عمل یا خواہش سے کچھ بوتا ہے وہ کچھ نہ صرف اپنی موجودہ زندگی بلکہ کئی جنموں تک کاٹتا رہے گا، جب تک کہ اعمال یا خواہشات کا اثر باقی رہے گا۔

ہستی کی اس دنیا پر حکمرانی کرنے والا قانون نظریہ عمل کہلاتا ہے۔ قانون عمل فرد سے بیرونی نہیں کوئی بھی فعل بیک وقت علت اور معلول دونوں ہے۔

نظریہ علیت

مظاہر دنیا علت اور معلول کی ایک زنجیر میں باہم مربوط ہیں۔ کسی متعین وجہ سے بغیر

کچھ واقع نہیں ہو سکتا۔ حواس کے سات جو کچھ بھی ہم دیکھتے' سنتے یا ادراک کرتے ہیں وہ کسی جانی یا نجانی علت کا معلول ہے دنیا کی تمام سائنس اور فلسفے متفقہ طور پر اعلان کرتے ہیں کہ قانون علت و معلول تمام قوانین میں سب سے زیادہ ہمہ گیر ہیں۔ ہمارے جسم یا ذہن کا کوئی بھی فعل کسی قوت یا طاقت کا نتیجہ ہے جو اس کی علت ہے۔

علیت کا یہ ہمہ گیر قانون سنسکرت میں ''قانون کرم'' کہلاتا ہے۔ اس ہمہ گیر مفہوم میں حس' حرکت' کشش' قوت' ثقل دافع قوت' چلنا' باتیں کرنا' دیکھنا' سننا' سوچنا' خواہش اور تمنا کرنا' جسم' ذہن اور عقل کے تمام افعال کرم ہیں۔

اس ہر جگہ موجود قانون کرم کے تحت حادثے اتفاق کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ جسے ہم حادثاتی یا اتفاقی واقعہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ حقیقت میں کچھ متعین علتوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ جنہیں ہو سکتا ہے۔ کہ ہم اپنے محدود علم کے حوالے سے نہ جان سکیں۔

چنانچہ تمام اتفاقی واقعات یا نام نہاد حادثاتی وقوعے قانون علیت کے تابع ہیں۔

درحقیقت علت ایک معلول کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یا معلول علت کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک نکتہ نظر کے مطابق معلوم علت میں بدستور موجود ہوتا ہے۔ تخریب کا مطلب معلول کی علت میں تبدیلی ہیئت ہے جس طرح دھوئیں کے پیچھے آگ ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرز زمان و مکاں کی تحدید اس میں اضافیت والی دنیا میں کاموں کے پیچھے نقائص اور نقصانات ہوتے ہیں اور کوئی ایسا فعل ڈھونڈنا ناممکن ہوتا ہے جو قطعی طور پر اچھا یا برا یا فطری حالت می مطابقت میں ملا جلا ہو' کیونکہ جو کسی ایک حالت میں اچھا نظر آتا ہے وہ دوسری حالت میں برا لگتا ہے۔ چنانچہ کوئی ہمہ گیر اخلاقی قانون یا ضابطہ موجود نہیں۔

عقیدہ عمل قانون علیت ہونے کی وجہ سے کہتا ہے کہ جیسا ہم بوئیں گے ویسا ہی کاٹیں گے۔ اچھا عمل ناگزیر طور پا اچھا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ایک اچھا عمل ناگزیر طور پر مفید ثابت ہوتا ہے اور مسرت کا باعث بنتا ہے۔ دوسری طرف برا عمل نقصانات پیدا

کرتا ہے اور تکلیف اور دکھوں سے دوچار کرتا ہے اعمال اچھے ہوں یا برے ' اپنے پیچھے کچھ امکانی قوت چھوڑ جاتے ہیں جو مستقبل میں یقیناً مسرت یا دکھ ' خوشی یا رنج پیدا کرتےہیے نظریہ عمل نہ صرف اس ازلی اخلاقی قانون بلکہ نتائج کا سامنا کرنے کی امکانی قوت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس زندگی میں ہم جس چیز کے بھی مالک ہیں وہ ہمارے سابق ذہنی وطبعی دونوں اعمال کا معلول ہیں۔ اگر ایک مرتبہ ہم یہ بات سمجھ سکیں کہ ہر فرد اپنے کیے ہوئے سابق اعمال کی فصل کاٹتا ہے تو تب ہم کبھی کبھی نظریہ تقدیر اور رحمت کی حمایت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر معلول اپنی علت کے پیانے پر ناپا جاتا ہے۔

نظریہ عمل پر یقین رکھنے والا شخص اپنے اچھے یا برے اعمال کے ان نتائج کا ذمہ دار ہوتا ہے جو زندگی میں اسے بھگتنے پڑتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا مقدر اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ اپنی سوچوں اور افعال کے ذریعہ میں اپنے کردار میں ترمیم اور اضافہ کرتا ہے۔ وہ اپنے اوپر نازل ہونے والی تکالیف کے لیے کبھی کسی اور کو الزام نہیں دیتا۔ تجربے کے ذریعہ وہ واقعات کی حقیقی وجوہات جانتا ہے برے یا شر کا خاتمہ کرتا ہے اور ایسے اعمال سرانجام دیتا ہے جو نیکی پیدا کرتے ہیں۔

قانون مکافات

نظریہ عمل میں صرف قانون علیت ہی نہیں بلکہ قانون مکافات بھی شامل ہے۔ جیسے ہر معلول کے لیے ایک علت ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح ہر نتیجے کے لیے اک شرط مقدم ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ علت اور اس کے معلول شرط مقدم اور نتیجے کے درمیان برابر کا توازن موجود رہے۔ ایک علت کیفیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے ایک ہی نوعیت کا معلول پیدا کرتی ہے' اور کوئی ردعمل لازماً عمل جیسا ہی ہوتا ہے۔ قدرت کی قوتیں نقصان کے لیے کارگر ہوتی ہیں۔ نہ فائدے کے لیے بلکہ یہ کامل توازن یا ہم آہنگی کے لیے کام کرتی ہیں۔ اگر یہاں پانی کا جوار بہت زیادہ ہے تو کہیں نہ کہیں لازماً بھاٹا ہے۔ اگر ایک جگہ پر زبردست گرمی ہے تو کسی اور جگہ پر شدید سردی ملے گی۔ جب

یہاں رات ہوتو امریکہ میں دن ہوتا ہے۔اوراس طریقے سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قطیت فطرت کے ہر شعبے میں موجود ہے۔اورانجام کارکامل توازن ہم آہنگی اور عدل پیدا کرتی ہے۔المختصر' اس کے نتیجے میں ہم کو مکافات یا سزاوجزا کہتے ہیں۔قانون مکافات بھی قانون علیت جتنا ہی ناقاب دفعہ اور عمل ورد عمل کے قانون جتنا ہی کڑا ہے۔

جس طرح طبعی فطرت میں ہر قوت مکافات کے لیے کام کرتی ہے۔اسی طرح ذہنی عقلی' اخلاقی اور روحانی میدانوں میں بھی یہی قانون مکافات اقلیم فطرت میں صراحتیں کر رہاہ۔قانون مکافات صرف بے جان مادے اور قوت میں ہی موجود نہیں بلکہ جاندار ہستیوں اور دانش مند روحوں پر بھی حکمران ہے۔جو کچھ بھی تکلیف ہم جسمانی یا ذہنی طور پر سہتے ہیں۔ممکن ہے ہمیں غیر منصفانہ لگے۔لیکن وہ ہمیں محسوس کرواتا ہے کہ ہم اس کے مستحق نہیں۔لیکن جب م اس کی علت ڈھونڈ تے ہیں اور اس سے اس کا موازنہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بالکل صحیح اور ایک منصفانہ مکافات عمل ہے۔

علتیں معلوم کی فطرت کا تعین کرتی ہیں اور مقدم شرائط اپنے نتائج کا۔اگر علت بری ہوتو نتیجتاً معلول برائی لائے گا۔کوئی بھی انسان اس قانون مکافات کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔انسان زندگی میں ہی یا اگلی دنیا میں اگلے جنم میں اپنے کیے ہوئے اعمال سے قائم کرتے ہیں' جب ہم اپنی موجودہ زندگیوں کا تعلق ماضی اور مستقبل کی زندگیوں سے قائم کرتے ہیں اور ماضی و مستقبل کی زندگی کے وسیع پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر اگر ہم اپنی موجودہ زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر قدم پر انصاف اور مکافات نظر آتے ہیں ہمارا حال ماضی کا نتیجہ اور مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔قانون مکافات ہماری انفرادی زندگیوں کے سارے سلسلے کا احاطہ کرتا ہے۔

قانون محشر

بحیثیت مجموعی ہر اچھا عمل قانون مکافات کے ذریعہ انعام کا باعث بنتا ہے۔اسی طرح ہر جبر یا برا کام قانون محشر کے تحت سزا دلواتا ہے۔چاہے یہ سزاوجزا اس زندگی میں

ہی ملے یا اگلی دنیا یا اگلے جنم میں۔ مثلاً جب کوئی ڈاکو کسی کو لوٹتا ہے تو پہلے خود کو لوٹتا ہے۔ دوسرے کو دھوکہ دینے والا شخص درحقیقت اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے۔ برے کام کے برے نتائج لازماً بھگتنا پڑتے ہیں۔

قانون محشر فطرت میں ایک بے رحم لزوم ہے۔ ہر عمل اپنے ردعمل میں پہلے اندرونی فطرت یا روح میں سزا و جزا کا باعث بنتا ہے۔ اور پھر فائدے خوشحالی یا بدحالی صحت یا بیماری کی صورت میں بیرونی حالات کو متاثر کرتا ہے۔

قانون عمل سکھاتا ہے کہ اپنے قول و فعل کے ذریعہ نیک آدمی خود کو انعام اور برے آدمی خود کو سزا دیتے ہیں۔ ایمرسن کہتا ہے ''کہ ہر فعل پہلے ہماری روح کے اندر صلہ دیتا ہے اور اس کے بعد ماحول میں۔ لوگ اس ماحول کو محشر کہتے ہیں''

قانون مکافات میں نظریہ عمل ہمیں لوگوں کے تکلیف زدہ ہونے کی وجہ بتاتا ہے۔ (چاہے انہوں نے زندگی میں کچھ برائی نہ کی ہو' چاہے وہ کسی بھی قسم کی اذیت کے حقدار نہ نظر آتے ہوں) اس کے باوجود پچھلی زندگی کے قانون محشر کے تحت وہ اس کے حقدار ہوتے ہیں۔ مذہب اسلام میں سابقہ یا آئندہ زندگیوں کا کوئی تصور موجود نہیں اسلام کے مطابق ہم اس زمین پر گزاری ہوئی ایک ہی زندگی کے اعمال کی سزا یا جزا روز قیامت کو پائیں گے۔ اور نیکی یا بدی کی بنیاد پر ہی جنت یا جہنم یعنی ابدی مسرت یا ابدی تکلیف کے مستحق ہوں گے۔

نظریہ تناسخ

نظریہ تناسخ عقیدہ کرم یا عمل کے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یہ ان قدیم ترین نظریات میں سے ہے جسے اہل مشرق نے حیات و ممات سے وابستہ مسائل حل کرنے کے ساتھ ساتھ حیات بعد از موت کی وضاحت کے لیے بھی قبول کیا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق روح لافانی ہے۔ یہ روح موجودہ جسم کی موت کے بعد نیا جسم اختیار کر لیتی ہے۔ یہ نظریہ روح کے وجود کو پہلے ہی سے ایک ہستی کے طور پر فرض کر لیتا ہے جو مادی

جسم کی بنا کے بعد بھی زندہ رہتی ہے تمام زمانوں کے مادیت پسند مفکرین نے اس نظریہ کو ماننے سے انکار کیا ہے' کیونکہ وہ روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے عیسائیت اسلام اور زردشت مت تناسخ کو قبول نہیں کرتے بلاشبہ ایک دور میں عیسائی اس نظریے پر یقین رکھتے تھے۔

نظریہ تناسخ یا آواگون کا اصل معنی روح کا ایک ج کی موت کے بعد دوسرے جسم میں چلے جانا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر اس کا مطلب ہے کہ روح خاص عرصے تک ایک مخصوص جسم میں مکین رہنے کے بعد موت آنے پر اسے چھوڑ جاتی ہے۔اور تجربہ حاصل کرنے کی خاطر کسی اور جسم (انسانی حیوانی یا ملائکی) میں داخل ہو جاتی ہے۔ جو اسے وصول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تناسخ یا آواگون کا اصل مطلب روح کی ایک جسم سے دوسرے جسم میں تقلیب ہے۔ یہ نیا جسم کسی جانور' انسان فرشتے یا پھر دیوتا کا بھی ہوسکتا ہے۔

یونانی فسلفیوں کے درمیان ہمیں فیثا غورث اور افلاطون نظری تناسخ ارواح کے معتقد ملے ہیں۔ ''فیدرس'' افلاطون بیان کرتا ہے کہ روحیں کیوں اور کیسے انسانی یا حیوانی سطح سے نم لیتی ہیں۔ یونانی فلسفیوں نے تصور تناسخ ارواح شاید مصر یا ہندوستان سے لیا تھا۔

افلاطون کا بیان کردہ نظریہ تناسخ اس نظریہ سے بہت کم مختلف ہے۔ جو اس کے عہد سے پہلے ہندوستان میں موجود تھا۔ تناسخ کے افلاطونی تصور میں روحوں کو اپنے تجربہ یا میلان طبع کے مطابق اپنے مسکن منتخب کرنے کی اجازت تھی لیکن اپنے اچھے اور برے اعمال کے فطری نتائج بھگتنے کی نہیں افلاطونی اور مصری نظریہ تناسخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ روحیں ایک ج کے چھوڑے کے بعد دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں جو آنے والی روحوں کا منتظر ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان نظریہ آواگون میں جسم روح کا منتظر نہیں' بلکہ اس کے برعکس' روح قوانین ارتقاء کے تابع ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشات اور رجانات و

فضائل کے مطابق طبعی جسم چنتی ہے۔

نظریہ تجسیم نو یا حشر

نظریہ تجسیم نو میں ہر انفرادی روح کی کم تر سے اعلیٰ تر منازل تک نشوونما اور ترقی موجود ہے۔ روح کم تر درجوں میں سے گزرنے کے بعد انسانی سطح پر آتی ہے اور احساس علم و حاصل کرتی ہے۔ اور انسانی سطح پر آنے کے بعد یہ حیوانی اجسام میں واپس نہیں جاتی۔

کثیف انسانی جسم اس کے اپنے لطیف جسم سے قریبی طور پر وابستہ ہے۔ مادی جسم لطیف جسم کا مظہر ہونے کی وجہ سے اس کی پیدائش نشوونما تنزل اور موت لطیف جسم کی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ جب تک لطیف جسم قائم رہتا ہے۔ یہ خود کو متعلقہ کثیف صورت میں ظاہر کرنا جاری رکھے گا۔ ہندوستانی فلسفہ میں یہ سارا عمل انفرادی روح کے عقیدہ تجسیم نو کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ "روح جسم سے زیادہ قدیم ہے۔ روحیں اس زندگی میں بار بار جنم لیتی ہیں"فیثاغورث ایمپی دوکلیز' افلاطون نے یونان اور اٹلی میں اس نظریہ تجسیم نو کو مقبول بنایا۔

تجسیم نو پر اعتقاد نہ رکھنے والے نابرابریوں اور اختلافات کی اس دنیا کی وضاحت ایک جنم یا موروثی ترسیل کے نظریہ سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عیسائیت اسلام اور زرتشت مت ایک جنم کے نظریہ کو مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہم یہاں اس دنیا میں پہلی اور آخری مرتبہ آئے ہیں۔

اس نظریہ تجسیم نو کے حق میں اہل ویدانت ایک **دلیل** یہ پیش کرتے ہیں کہ "کائنات میں کبھی کچھ بھی فنا نہیں ہوتا"۔ فنا کے معنی کسی چیز کی موت ویدانتی فلسفیوں میں بالکل جدید سائنس دانوں کی طرح ہی غیر معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں "غیر موجود کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اور موجود نابود نہیں ہو سکتا"۔ بہ الفاظ دگیر عدم وجود میں نہیں آسکتا اور

موجود معدوم نہیں ہو سکتا۔ یہ قانون فطرت ہے۔

بھگوت گیتا کے مطابق ''جنم کے بعد موت اور موت کے بعد لازماً جنم ہوتا ہے ہمارا جسم تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن اعمال ہمارے اندر ایک غیر آشکار صورت میں بدستور موجود رہیں گے۔ یہ ہرگز فنا نہیں ہوں گے

نظریہ تجسیم نو میں سب سے پہلے فارس میں نمودار ہوا اور اس کے بعد ازاں عہد نامہ جدید کی تحریروں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ تب سے ہی یہ عیسائیوں میں وسیع پیمانے پر مقبول ہے۔ عام فہم کے حوالے سے نظریہ تجسیم نو یہ وضاحت نہیں کرتا کہ ایک شخص گناہ گار فطرت اور دوسرا شخص نیک فطرت لے کر کیوں پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ نظریہ تقدیر اور اس بات کو پہلے سے فرض کر لیتا ہے کہ انفرادی روح کا جنت یا دوزخ میں جانا اس کا مقدر ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے سب سے پہلے اس نظریہ تقدیر یا رحمت کو یہ وضاحت کے لیے پیش کیا کہ ایک شخص برا اور دوسرا نیک کیوں پیدا ہوتا ہے۔

زرتشت کے پیروکار جسمانی نہیں بلکہ روحانی تجسیم نو پر یقین رکھتے ہیں اور اسے معجزہ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مسیح کا دوبارہ جنم معجزاتی تھا۔

ہندوستانی فلسفہ میں نظریہ عمل

ہندوستان میں جین مت بدھ سانکھیہ اور میماسا نظام ہائے فلسفہ کے مطابق عمل یا کرم خدا کی مرضی سے آزاد طور پر کام کرنے والا خود مختار اور مجرد قانون ہے۔

ویدوں میں اس نظریہ پر غور و خوض کیا گیا ہے۔ ویدوں میں اچھے اعمال کا محافظ' اچھا اور برا فعل دیکھنے والا' تمام کرم کا آقا جیسے القاب دیوتاؤں کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اچھے افعال کا نتیجہ لافانیت کی صورت میں روح جنم اور موت کے چکر میں پڑتی ہے۔ ویدوں کی رو سے انسان کو اس زندگی میں اپنی گزشتہ زندگیوں کے اعمال کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

بدھ مت کے فلسفہ میں نظریہ کرم کی بنیاد منحصر ابتدا کے نظریہ پر ہے۔ بدھ مت کہتا

ہے ”اپنے اعمال کی وجہ سے انسان ایک جیسے نہیں ۔ بلکہ کچھ زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں اور کچھ کم عرصہ تک کچھ صحت مند ہیں اور کچھ غیر صحت مند وغیرہ۔ اس نظریہ کی رو سے ہر انسان اپنے افعال و اعمال کا ذمہ دار ہے۔ عمل کا پھل لازماً ملتا ہے ہر فرد کے مستقبل کا انحصار اس کے موجودہ اعمال پر ہے۔

ہندو نیایہ و یشیشک نظاموں میں قانون عمل خدائے مطلق کی زیر رہنمائی و ہدایت ہے جو دنیا کی تخلیق اسی قانون کے مطابق کرتا ہے۔ خدا ہی اعمال کے فائدہ مند یا نقصان دہ ہونے کا تعین اور اسی کے مطابق مسرت یا دکھ کا فیصلہ کرتا ہے۔

فلسفہ ویدانت کہتا ہے کہ نظریہ کرم سوچنے یا عمل کرنے اور خوشی یا دکھ اٹھانے والے کی غیبت کو ضروری قرار دیتا ہے۔ چونکہ عمل کا یہ سلسلہ بے ابتدا و بے انتہا ہے اس لیے یہ موجودہ پیدائش سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ ہر انفرادی روح آج اپنے سابق اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اچھے یا برے اعمال کے ذریعہ مستقبل کے نتائج کا بیج بو رہی ہے۔

نتیجہ بحث

تمام ذہنی یا جسمانی کام سرانجام دینے کے لیے چار بنیادی شرائط موجود ہیں اول ہمارا ایک طبعی جسم ہونا چاہیے۔ جو توانائی کا منبع ہے۔ جس کے بغیر ہم طبعی سطح پر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مزید برآں' یہ جسم اچھی حالت میں ہونا چاہیے' دوم ہمیں کوئی کام کرتے وقت کسی خواہش یا محرک سے آگاہ ہونا چاہیے۔ سوم ہمارے پاس پانچ اعضائے ح کے آلات ہونے چاہئیں یعنی آنکھیں' ہاتھ' کان' زبان' اور ناک کوئی کام کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ چہارم ہاتھوں اور پاؤں کے علاوہ ذہنی قوت' قوت ارادی' علم' ارادہ اور حافظہ کسی بھی کام کے لیے لازمی ہیں۔

ان شرائط کے تحت انجام دیے ہوئے اعمال کے نتائج تین قسم کے ہیں۔ (۱) جو قابل خواہش ہیں۔ کیونکہ وہ زندگی میں ہمارے مقاصد کی تکمیل کرتے اور راحت و

مسرت دیتے ہیں (۲) جو قابل خواہش نہیں۔ اور (۳) جو جزوی طور پر قابل خواہش اور نا قابل خواہش ہیں۔

فعالیت کو زندگی کی ناگزیر شرط تسلیم کرتے ہوئے کوئی بھی انسان کسی نہ کسی قسم کا کام سرانجام دیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ چاہے وہ کام طبعی ہو یا ذہنی۔

انسان کو صلہ کی خواہش چھوڑ کر صرف اور صرف عمل کرنا چاہیے۔ سو پھل کی خواہش کریں اور نہ ہی عمل سے منہ موڑیں۔ اس انداز میں عمل کریں کہ آپ کے افعال آپ کو کسی بندھن میں نہ باندھیں۔

قانون عمل کو سادہ ترین انداز میں اس مشہور مقولے سے بیان کیا جا سکتا ہے: ''جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے'' اچھے یا برے تمام اعمال نتیجتاً عمل کرنے والے کی زندگی میں مناسب معلول پیدا کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ اعمال صلے کی خواہش کے تحت سرانجام دیے گئے ہوں۔ ماضی' حال اور مستقبل کے ہمارے تمام اعمال فرد کی موجودہ یا آئندہ زندگی میں اپنے معلول پیدا کریں گے۔ کسی قسم کی لگاوٹ سے آزاد' کامیابی اور ناکامی سے غیر متاثر اور پھل کی خواہش کو سامنے رکھے بغیر متواتر عمل کرنے والے لوگ دانا اور حقیقی روحانی کارکن ہیں۔

☆☆☆

۸ :: خدا کا وجود

"خدا محبت ہے خدا دانش ہے خدا صداقت ہے"۔ (آروبندو)

خدا جیسی کوئی ہستی موجود ہونے یا اس کے وجود سے قطعی طور پر انکار کرنے کے لیے صدیوں سے فلسفی، سائنس دان اور الہیات دان دلائل پیش کرتے آئے ہیں۔ یہ فلسفہ مذہب کے مسائل میں سے ایک ہے۔ کیونکہ خدا پر یقین نے مذہبی عیقدے اور سرگرمی میں ہمیشہ ایک مرکزی حیثیت قائم رکھی ہے۔ اس موقع پر ہمیں خدا کے تصورت خدا کی فطرت اور اس کے وجود کے لیے دلائل کی اقسام کے درمیان ایک قریبی تعلق پیدا کرنا ہے۔ ہم خدا کے تصورات اور فطرت کے حامل تبھی ہو سکتے ہیں جب خدا اور دنیا مذاہب عالم اور روجود خدا کے لیے دلائل کے تعلق کا مشاہدہ کریں۔

یہاں ہم خدا پر یقین اور خدا کے وجود کے لیے مخصوص روایتی دینیاتی دلائل پیش کریں گے۔

دینیاتی دلائل

دینیالی دلیل بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتدائی ترین جڑیں غالباً افلاطون کی فکر میں ہیں جس نے دلیل دی تھی کہ طبعی کائنات ہمارے ذہن کا غیر معقول یا نا قابل فہم حصہ ہے۔ یہ دلیل تجربی ذرائع کی مدد سے خدا کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے مطابق خدا ارتقاء کا ایک ذہین ڈیزائنر ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ فطری نظام میں ایک مقصد یا غایت موجود ہے۔ یہ کائنات ایک مقصد رکھتی ہے جو دنیا پر حکمران ہے۔ جہاں کہیں کوئی مقصد ہو وہاں لازماً ایک تجویز کنندہ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح جہاں کوئی منصوبہ ہو وہاں ایک منصوبہ ساز بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ منصوبہ ساز کون ہے؟ اس منصوبہ ساز کی فطرت کیا ہے؟

کائنات محض واقعات ہی کا ایک مجموعہ نہیں۔ بلکہ ایک تنظیم یافتہ جمعیت ہے جس

میں نظم ہی ہم آہنگی اور قاعدہ ہے۔ یہ بات اس کی جانب دلالت ہے کہ لازماً ایک قادر مطلق' ذہین اور باشعور منصوبہ ساز موجود ہونا چاہیے۔ جس نے کائنات تخلیق کی ہے وہ قادر مطلق کائناتی منصوبہ ساز خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

مزید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ایک باتنظیم منصوبہ موجود ہے جو ساری مظہری دنیا پر حکمران ہے۔ فلک میں کروڑوں ستارے ایک خاص قاعدے میں چلتے ہیں۔ پیچیدہ زندہ نامیاتی جسم میں مناسب طور پر وظائف سرانجام دیتے ہوئے ہزاروں اعصابی خلیے ہیں۔لہذا نباتات و حیوانات کی زندگی میں بھی نظم موجود ہے۔ مندرجہ بالا مثالیں دنیا کے دانا منصوبہ ساز کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔

پالے کی پیش کردہ گھڑی کی تشبیہ اس دلیل کا جوہر ہے۔فرض کریں کہ کسی صحرا میں چلتے ہوئے زمین پر پڑا ایک پتھر دیکھتا ہوں۔ میں خود کو قائل کرتا ہوں کہ قدرتی عمل کے تحت یہ پتھر متشکل ہوا۔لیکن اگر میں زمین پر پڑی ہوئی کوئی گھڑی دیکھوں تو میں اسے قدرتی عمل کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتا۔ ایک گھڑی گراریوں' پچوں' سپرنگوں وغیرہ کی پیچیدہ ترتیب پر مشتمل ہوتی ہ۔ جو وقت کی پیائش کے لیے بالکل درست طور پر باہم کام کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم کافی بہتر طور پر ایک ذہین منصوبہ ساز کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ جس نے گھڑی بنائی ہے۔ پالے دلیل دیتا ہے کہ دنیا ایک پیچیدہ مشین ہے۔ جسے ایک مطلق منصوبہ ساز نے بنایا اور وہ منصوبہ ساز خدا ہے۔

منصوبہ سازی کے حوالے سے ڈیوڈ ہیوم نے ''فطری مذہب پر مکالمے'' میں کہا ہے کہ دنیا ایک عظیم مشین کی حیثیت میں باظم اور کامل طور پر چلتی ہے۔ گھڑیوں اور مکانات جیسے انسانی منصوبوں کی علت سوچ' شعور اور عقل ہے۔ چنانچہ ایک قسم کی باشعور ہستی لازماً موجود ہونی چاہیے' جو کائنات میں معلومات کی علت ہے۔ خدا ہی ہے جس نے تمام چیزوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ بنایا۔

تنقید

تاہم اس دلیل کے خلاف کچھ اعتراضات موجود ہیں۔

(۱) منصوبے والی دلیل خدا اور دنیا کے مابین تعلق کو انسان اور مشین کے مابین تعلق جیسا سمجھتی ہے۔ انسان اور مشین دونوں معروضی مظہر اور عارضی و محدود ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر خدا بھی گھڑی ساز جیسا منصوبہ ساز ہے تو وہ بھی دنیا کے ذریعہ محدود ہے۔ گھڑی ساز نے پہلے سے موجود چیزوں میں سے گھڑی تیار کی' کیا یہ بات اسی انداز میں خدا پر بھی قابل اطلاق ہے۔

کانٹ نے نشاندھی کی کہ منصوبے والی دلیل دنیا کے ایک نقشہ ساز کا وجود ثابت کرتی ہے' لیکن خالق کا نہیں۔ اور یہ منصوبہ ساز دنیا میں محدود ہے۔

ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے غائیت کو بطور قادر مطلق سمجھا جاتا رہا ہے نہ کہ بطور ماورائے حدود۔ ایسا نہیں کہ خدا خود کو مہیا کردہ مادوں سے باہر رہتا ہے۔ وہ خارجی اختراع ساز نہیں بلکہ اندر بسا ہوا' چیزوں کا موجد ہے۔ جو انہیں کسی مخصوص منصوبے اور ڈیزائن کے تحت بناتا ہے۔

(۲) غائیت کے حوالے سے یہ دلیل ایک لازمی ہستی کا وجود ثابت نہیں کرتی۔ وہ ہستی جو اول علت یا کائنات کی خالق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ صرف اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کائنات ایک منصوبے کی پیداوار ہے۔ جس کے لیے ایک منصوبہ ساز ضروری ہے۔ اگر وہ واقعی موجود ہے تو اسے ''خدا'' کہنا چاہیے۔ روایتی طور پر ہم اسے ''خدا'' کا نام دیتے ہیں جو گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔

(۳) لفظ ''نظم'' بہت زیادہ واضح نہیں۔ یہ ایک نسبتی اصطلاح ہے۔ کوئی شے جو ایک شخص کو بانظم لگتی ہے۔ دوسرے کو نہیں لگے گی۔ نہ ہی یہ واضح ہے کہ کائنات کسی بھی مخصوص مفہوم میں بانظم ہے۔ دنیا میں بہت سی بدنظمیاں بے آہنگیاں اور تباہیاں موجود ہیں۔ فطرتاً تمام چیزیں موزوں طور پر مرتب شدہ یا تنظیم یافتہ نہیں۔ نظم یا مقصد منصوبہ

سازی کا نتیجہ نہیں۔

یہاں غائی دلیل کی حمایت کرنے والا جواب دے گا کہ نباتات اور حیوانات کا نظم یکساں نہیں' جیسا کہ گھڑی یا گھر کے معاملہ میں ہے۔ الوہی منصوبہ ساز کا نظم اور منصوبہ نسبتی نہیں بلکہ مطلق ہے۔

(۴) ہیوم کے مطابق ہم تشبیہ کے ذریعہ استدلال پیش کرنے میں کامل یقین کر تسکین نہیں دے سکتے۔ ایک طرف کائنات اور دوسری طرف مشینوں' گھروں وغیرہ جیسی چیزوں میں وسیع اختلاف ہے۔ دنیاوی اور انسانی نقشہ گر کی تشبیہ بہت کمزور ہے۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے مانند نہیں۔

(۵) اگر ہم کامیابی کے ساتھ دنیا کا ایک الوہی منصوبہ ساز مستنبط کرلیں تو پھر بھی ہم دانا خدا اور ذہین خدا کا دعویٰ کرنے کے مجاز نہیں اس کے علاوہ ایک محدود دنیا سے ہم لامحدود خالق کو مستنبط نہیں کرسکتے۔

تکوینیاتی دلیل

تکوینیاتی یا علتی دلیل کا آغاز اس تصور سے ہوتا ہے کہ دنیا خدا کا معلول ہے' اور خدا علت اول ہے۔ وسیع تر معنوں میں دنیا سے خدا کی طرف جانے والی کسی بھی مواحدانہ دلیل کو تکوینیاتی کہا جاسکتا ہے' بشمول دینیاتی دلیل کے۔

ارسطو کے نزدیک علت اول کی دلیل تکوینیاتی کہلاتی ہے کیونکہ اس کے خیال میں ہر واقع ہونے والی چیز ایک علت رکھتی ہے۔ اور اس علت کی بھی ایک اپنی علت ہوتی ہے اور یہ لامحدود سلسلہ چلتے چلتے علت اول تک پہنچتا ہے۔ اگر وہ علت اول خدا ہے' جس کو اپنے ہونے میں کوئی علت درکار نہیں تو اس صورت میں لامحدود سلسلے کا امکان خارج ہو جاتا ہے۔

خدا کو کائنات کی علت اول ماننے والوں کو اس علت کی فطرت کا تعین کرنا چاہیے۔ کیا خدا مستعد یا مادی علت ہے؟ شاید وہ کائنات کی مستعد علت بھی ہے اور مادی علت

بھی۔

اس دلیل کے مطابق ہر چیز ایک علت رکھتی ہے۔ اگر اسے اصول علت کے حوالے سے تسلیم کر لیا جائے تو پھر خود کائنات کی کوئی علت ہونا لازمی ہے۔ وہ علت خدا ہے' چنانچہ خدا موجود ہے۔ یوں خدا کائنات کی لامحدود علت اول ہوا۔

تنقید

یہ دلیل بھی چند مندرجہ ذیل حدود رکھتی ہے:

(۱) خدا کو محدود علتی سلسلے کے ساتھ جوڑنا مشکل ہے۔ اگر خدا علت اول ہے تو پھر وہ بھی محدود علتی سلسلے کے ماتحت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خدا ایک معلول ہونے کی وجہ سے اپنی ایک علت بھی رکھتا ہے۔ اگر وہ علتی زنجیروں سے ماورا ہے تو اس کے اور اس کی تخلیق کے مابین کوئی تعلق ڈھونڈنا ناممکن ہے۔

(۲) مشہور برطانوی تجربیت پسند ڈیوڈ ہیوم کا کہنا ہے کہ علت اور معلول دونوں محدود ہیں۔ اگر یہ بات درست مان لی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا بھی محدود ہے۔

(۳) کانٹ کا اعتراض زیادہ طاقتور ہے۔ علیت مظاہر کی ایک کیٹگری ہوتے ہوئے ہمیں مظہر سے ماورا نہیں لے جا سکتی۔ اور مظہر کے اندر خدا کا تصور قائم رہتا ہے۔ سو یہ لامتناہی سلسلے کی جانب اشارہ کناں ہے۔

(۴) قانون علت کے مطابق ہر چیز کی ایک علت ہے' اور اگر یہ درست ہو' تو خدا کی بھی ایک علت ہونی چاہیے۔ اور اگر خدا کی کوئی علت نہیں تو پھر یہ بھی درست نہیں کہ ہر چیز کی ایک علت ہوتی ہے۔

(۵) ہم جانتے ہیں کہ دو علتیں موجود ہیں...... مادی اور مستعد...... جو چیزوں کی پیداوار کے لیے لازمی ہے۔ کوزے کے مقابلے میں کوزہ گر مستعد اور مٹی مادی علت ہے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا کائنات کی مستعد یا آلاتی علت ہے تو پھر اس کے لیے کسی

علت یا مادے کی مدد کے بغیر تخلیق کرنا ناممکن ہوگا۔ اس کے برعکس اگر مادی علت سے مراد علت اول ہے تو وہ بھی دنیا کی تمام محدود چیزوں کی طرح ارتقاء کی تبدیلیوں میں سے گزرا ہوگا۔

وجودیاتی دلیل

وجودیاتی دلیل تصورات یا انسانی تجربہ سے خدا کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ دلیل سب سے پہلے ایک عہد وسطی کے فلسفی اینت اینسلم (Anselm) نے پیش کی۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس کامل ہستی کا ایک تصور ہے۔ اور خدا نے ہماری مراد وہی کامل ہستی ہے۔

مزید دلیل کچھ یوں ہے:

''خدا وہ ہستی ہے جس سے زیادہ عظیم کسی ہستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا'' اب ہمارے پاس اس قسم کی ہستی کا تصور ہے۔ لیکن ایسی ہستی کے تصور کے لیے وجود لازمی ہے۔ اگر وہ موجود نہیں تو وہ اتنا عظیم نہیں جتنا کہ ہونے کی صورت میں ہوتا' اور تعریف کی رو سے وہ قابل تصور وہ عظیم ہستی ہے چنانچہ اس قسم کی ایک ہستی موجود ہے۔

یہ واضح ہے کہ ''عظیم'' سے اینسلم کی مراد زیادہ کامل' اعلیٰ ترین اور مطلق ہے۔ خدا کو ایک کامل رین ہستی بیان کرنے کی بجائے اینسلم خدا کو ایسی ہستی بیان کرتا ہے جو اس قدر کامل ہے کہ اس سے زیادہ کسی چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

وجودیاتی دلیل میں اینسلم نے نشاندہی کی کہ کامل ترین قابل ہستی لازماً ذہن کے ساتھ ساتھ حقیقت میں بھی موجود ہے۔ اس نے خدا کو ایک لازمی وجود کہا' سوائے غیر موجود سمجھنا ناممکن ہے۔ کیونکہ جس چیز کو موجود سمجھا جائے اسے غیر موجود نہیں سمجھا جا سکتا۔

ڈیکارٹ نے اس دلیل میں کچھ تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس نے کہا کہ خدا ہی کامل ترین ہستی کے اس تصور کی علت ہے۔ کاملیت کا مطلب اس کی نظر میں صفات' قوت'

نیکی، علم اور وجود بھی ہے۔ چنانچہ خدا سے کمتر کوئی بھی چیز اس قسم کے ایک تصور کی علت نہیں ہو سکتی جو ڈیکارٹ کے مطابق ایک خلقی تصور ہے۔

تنقید

(۱) کانٹ نے اس دلیل پر سات اعتراضات کیے ہیں۔ اس کے مطابق کسی چیز کے محض خیال سے اس کی حقیقت کو نہیں گھٹا سکتے۔ لیکن اگر کسی چیز کو موجود ہونا ہے تو اسے تجربہ میں لازماً آنا ہوگا۔ یہ وجودیاتی دلیل سوچ اور وجود کے مابین موزوں فرق کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ کانٹ نشاندہی کرتا ہے۔ کہ میں اپنے جیب میں ایک سو ڈالرز کا تصور کر کے ان کا وجود ثابت نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح ہمارے ذہن میں خدا کا تصور ہے۔

(۲) فرانس کے ایک بھکشو گانیلون نے دعویٰ کیا تھا کہ اینسلم کے استدلال کو اگر دیگر میدانوں میں لاگو کیا جائے تو یہ مجرد نتائج تک لے جائے گا۔ اسنے ایک کامل ترین کے لیے ایک متوازی وجودیاتی دلیل قائم کی۔ اس نے کامل ترین قابل تصور جزیرے کی بات کہی، لیکن اسکی دلیل کو موخر تصور کے حوالوں سے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا ایک جزیرہ تصور کر کے اینسلم کا اصول استعمال کرتے ہوئے ہم دلیل دے سکتے ہیں کہ یہ حقیقتاً موجود ہوئے بغیر کامل ترین قابل تصور جزیرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا حقیقت میں موجود نہیں تو اسے کامل ہستی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) اگر وجود ایک ''کاملیت'' اور خدا کامل ترین ہے تو خدا کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن وجود ایک صفت یا خصوصیت ہے۔ کسی صفت کا کامل ہونے کے لیے کسی چیز کا پہلے موجود ہونا لازمی ہے۔ لیکن خدا کا وجود اس کی کاملیت میں سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) ڈیکارٹ کی وجودیاتی دلیل دعویٰ کرتی ہے۔ کہ وجود کو خدا کا تعین کرنے والی توثیقات میں اس طرح شامل ہونا چاہیے ج طرح اندرونی زاویے دو قائمہ زاویوں ک برابر ہیں جو ایک مثلث لازمی خصوصیت ہیں۔ لیکن کانٹ کہتا ہے کہ موضوع اپنی توثیقات کے ساتھ واقعی موجود ہے۔ تجزیاتی اعتبار سے تو یہ درست ہے کہ اگر ایک

مثلث موجود ہے تو اس کے تین زاویے لازماً ہونے چاہئیں اور اگر ایک لامحدود طور پر کامل ہستی ہے تو اس موجود ہونا چاہیے۔ جیسا کہ کانٹ نے کہا ایک مثلث بنایا اور اس کے تین زاویوں کو مسترد کرنا بھی کود تضاداتی ہے۔ لیکن مثلث کو اس کے تین زاویوں سمیت مسترد کر دینا خود تضاداتی نہیں۔ یہی بات مطلق طور پر لازمی ہستی کے معاملہ میں بھی صادق آتی ہے۔

(۵) خدا کی تعریف ہمارا تصور خدا بیان کرتی ہے۔ لیکن ہم کسی ایسی ہستی کا حقیقی وجود ثابت کر سکتے ہیں ہ میز' قائد' گائے' گھر وغیرہ جیسے الفاظ بول سکتے ہیں ل جو اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا میں حقیقی طور پر موجود ہیں۔ اسی طرح ہم کہیں کہ سونے کا پہاڑ موجود ہے' تو یہ بات اس کے وجود کی توثیق نہیں کرتی۔ کیونکہ درحقیقت سونے کا پہاڑ منفی وجودیاتی بیان ہے اس لیے وہ موجود نہیں۔ اسی طرح خدا منفی وجودیاتی بیان ہے اور وجود نہیں رکھتا۔

اخلاقی دلیل

خدا میں یقین کی اخلاقی دلیل کی بنیاد پر انسان کی اخلاقی فطرت اور مذہبی تجربے پر ہے۔ یہ اخلاقی دلیل کانٹ سے شروع ہوتی ہے جو اپنی Critique of Practical Reason میں استدلال کرتا ہے۔ کہ خدا کا وجود عملی یا اخلاقی استدلال کی شرط مقدم ہے۔

کانٹ کے مطابق خدا کا وجود شرط مقدم یا اخلاقی زندگی کا پیش مفروضہ ہے۔ اپنے کامل اچھائی کے نظریہ میں کانٹ نشاندہی کرتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی چیز کو سمجھنا سرے سے ہی غیر ممکن ہے۔ حتیٰ کہ کچھ اخذ کرنا بھی ممکن نہیں۔ المختصر اعلیٰ ترین نیکی کو فروغ دینا ہمارا فرض ہے۔

یہ دلیل معروضی اخلاقی قوانین سے الوہی قانون دہندہ تک ایک منطقی استنباط کے طور پر بھی پیش کی جاتی ہے۔ مختلف افراد کی یہ اخلاقی اقدار اور اخلاقی تجربات دنیا میں خدا کی

موجودگی پر دلالت کرتے ہیں۔خدا ہمارے لیے بلند ترین اخلاقی مثالی نمونہ ہے۔بلند ترین اخلاقی مثالی نمونہ حقیقی ہے۔ہماری روحانی اور اخلاقی زندگی کو حقیقی اخلاقی اقدار کے منبع کی ضرورت ہے اور وہ منبع خدا ہے۔وجود خدا کے بغیر اخلاقی قانون اور اخلاقی نظم دنیا میں پھل پھول نہیں سکتا۔

ہم یہ استدلال بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اگر مذہبی تجربہ موجود ہے (جو تقریباً خدا کے تجربے جیسا ہی ہے) تو یہ صرف تبھی ممکن ہے جب خدا موجود ہو۔جس طرح ہم مختلف مذاہب کے مذہبی تجربات کی تردید کر سکتے ہیں بالکل اسی طرح خدا کے وجود سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔

آخری بات یہ کہ ہم نے کچھ معجزات دیکھے ہیں مختلف دیوتاؤں اور نبیوں کی رحمت' الوہی یا وجدانی تجربات جو ہمیں وجود خدا پر قائل کرتے ہیں۔

تنقید

(۱) کسی شخص کی اخلاقی زندگی کا انحصار لازمی طور پر خدا کے وجود پر نہیں جیسا کہ کانٹ نے دلیل پیش کی تھی۔کانٹ کی طرف سے یہ پیش مفروضہ کہ اچھے اعمال کا اچھا صلہ ملتا ہے۔تمام صورتوں میں درست ثابت نہیں ہوتا۔اعلیٰ ترین نیکی اور ''خدا'' کے درمیان کوئی لازمی تعلق موجود نہیں ہے۔

(۲) کانٹ کی ''اعلیٰ ترین نیکی'' ممکن ہے اور اس کے ممکن ہونے کے لیے خدا کو ایک اخلاقی اور قادر مطلق ہستی کے طور پر موجود ہونا چاہیے۔لیکن اس سیاق وسباق میں ''ممکن'' سے کیا مراد ہے اس کا مطلب محض ''منطقی طور پر ممکن'' ہو سکتا ہے۔لیکن حقیقت میں کانٹ کی دلیل تقاضا کرتی ہے کہ جب ہم اعلیٰ ترین نیکی کے ممکن ہونے کی تصدیق کرتے ہیں تو اس سے محض منطقی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر ممکن ہونے کی تصدیق کر رہے ہوتے ہیں۔

(۳) اخلاقی دلیل کے مطابق اخلاقی قوانین ایک قانون دہندہ کو پہلے سے فرض

کر لیتے ہیں جو خدا کا وجود ثابت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قدرتی قوانین کسی قانون دہندہ کو پہلے سے فرض نہیں کرتے۔ اگر ہمارے لیے کوئی قانون ضروری ہی ہے تو وہ ہم جیسی ہی کوئی محدود ہستی ہوگی۔ وہ لازمی طور پر خدا ہی نہیں ہ۔ فطری قانون دہندہ یا اخلاقی قانون دہندہ کے طور پر خدا کے ایسے تمام تصورات سائنس دانوں اور مفکرین نے رد کیے ہیں۔

(۴) اخلاقی قوانین اور اقدار اخلاقی نظام کی دنیا میں نافذ ہوسکتی ہیں۔ نظام دنیا میں ہم اخلاقی یا غیر اخلاقی سرگرمیوں کی توقع نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ درجہ بدرجہ لوگ اخلاقی قوانین اور اخلاقی اقدار سے روگردان ہو رہے ہیں۔ اس لیے اگر خدا کا بنایا ہوا اخلاقی نظام بھی موجود ہو وپھر برائی اور بدنظمی کیسے موجود ہو؟

(۵) مذہبی تجربہ معجزہ' دعائیں' عبادت اور رحمت خالصتاً نفسیاتی اور انسان کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ واقعاتی دنیا کی صداقت کی ضمانت نہیں دیتیں۔ یہ ہپناٹزم یا جادو ہی کی کوئی صورت ہوگی' جو خدا کا وجود ثابت نہیں کرتی۔

خدا کے وجود کا مسئلہ

خدا کے وجود کا مسئلہ' فلسفہ میں ایک مسئلہ کے طور پر افلاطون کے دور سے مرکز بحث رہا ہے۔ خدا کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ وہ قطعی کوئی تصور نہیں تاہم' اصطلاح ''خدا'' معنی خیز ہے۔ کچھ منطقی ایجابیت پسندوں نے یعنی اے جے آئر' ایم شلک' کارناپ وغیرہ نے معنویت کی ایک کسوٹی تشکیل دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بیان ا صورت میں معنی خیز ہوسکتا ہے۔ جب اس میں عوامی قسم کے کچھ مشاہدات موجود ہوں جو بیان کی سچائی یا جھوٹ سے متعلقہ ہوں۔ لیکن توثیق پسندوں کا معنی کے بارے میں نکتہ نظر بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنتا آیا ہے۔ وٹگنسٹین کے مطابق زبان کے بہت سے اور مختلف وظائف ہیں۔ کسی اصطلاح کا معنی صرف اپنے استعمال سے معلوم ہوتا ہے نہ کہ اپنی پڑتالوں یا توثیقات سے۔ خدا انسان سے محبت کرتا ہے نسبتاً سادہ طریقے سے بیجد

پیچیدہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔بیان کے استعمال میں فرق بیان کے معنی میں بھی فرق ڈالتے ہیں۔چنانچہ وٹگنسٹین کا نکتہ نظر یہ ہے کہ فلسفی مذہبی زبان کو اپنا کر اسے زیادہ لچک دار اور ہمدردانہ بنا سکتے ہیں۔

کسی بیان کے بامعنی ہونے یا نہ ہونے کا مطلب یہ دیکھنا ہے کہ وہ لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔مذہبی لوگ' بشمول الٰہیات دان' جب احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ بات کرتے ہیں تو ان میں لفظ ''خدا'' شامل ہوتا ہے تو وہ اپنی کہی ہوئی بات کو سمجھتے ہیں۔ای ایسما اسکل کہتا ہے کہ یہ امر تجربہ ہے کہ بیانات اسی سیاق وسباق میں بامعنی ہوتے ہیں جس میں دینیاتی بحث ہو رہی ہوتی ہے۔

اہل ایمان نہ صرف خدا کے موجود ہونے پر یقین رکھتے ہیں بلکہ اس کے متعلق بہت سی چیزوں کے وجود پر بھی ایمان رکھتے ہیں یہ ہمیشہ واضح ہوتا ہے ک ان میں سے کتنی چیزیں صریح طور پر ان کے تصور کردہ ''لفظ' خدا میں شامل ہوتی ہیں نتیجتاً جب وہ ''خدا'' کا استعمال کرتے ہیں تو لازمی نہیں کہ ان کی مراد اس سے بالکل وہی ہو۔

''خدا'' کی مختلف تعریفیں اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں' بشرطیکہ ہم اس بارے میں کسی الجھن کا شکار نہ ہوں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہر تعریف کو دوسری کے سامنے رکھ کر پرکھیں۔چنانچہ ایک تعریف میں ہوسکتا ہے کہ ہمیں خدا سے منسوب X خصوصیت ملے اور کسی دوسری تعریف میں Y اور Z۔

آیئے اصطلاح ''خدا'' کی کچھ تعریفوں پر غور کرتے ہیں۔سینٹ اینسلم کی پیش کردہ خدا کی تعریف ہے کہ ''خدا ایسی عظیم چیز ہے جس سے زیادہ عظیم کسی چیز کا تصور نہیں کیا جاسکتا'' عظیم سے اس کی مراد علی یا زیادہ کامل ہے۔جے این فنڈ لے تصور خدا کو 'مذہبی رویوں کے معقول معروض کا تصور'' کہتا ہے۔ایف سی کاپلیسٹن کا کہنا ہے کہ خدا مطلق شخصی ہستی ہے۔برٹرینڈ رسل بھی اس نکتہ سے متفق ہے۔ڈیکارٹ نے اپنی کتاب Third Meditation میں کہا ہے کہ خدا ایک مطلق طور پر کامل ہستی ہے۔

مابعد الطبیعیاتی نکتہ نظر سے خدا اعلیٰ ترین حقیقت ہے۔ اعلیٰ ترین قدر اور اعلیٰ ترین مقصد۔

تاہم ''خدا'' کی معنویت اور بحیثیت مجموعی مذہبی بیانات کے حوالے سے کچھ تنقید موجود ہے۔ اے جے آئر کہتا ہے کہ خدا ایک خالصتاً وجدان کا معروض ہے۔ لہٰذا اسے استدلالی حوالوں مٰیں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خدا کی فطرت ایک اسرار ہے جو انسانی فہم سے ماورا ہے اور ناقابل استدلال شے کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس کے مطابق خدا کے لیے دلائل بامعنی ہیں اور نہ ہی قابل توثیق۔

انٹونی فیلو مذہبی اہل ایمان کو ایک دعوت مبارزت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ک کسی بھی بامعنی بیان کو جھٹلائے جانے کے قابل ہونا چاہیے۔ عالم دین کے لیے فلیو کی رائے ہے کہ جو دخدا کے خلاف کوئی بھی ثبوت پیش کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ خدا کی موجودگی کا دعویٰ حقیقت میں دعویٰ ہی نہیں کیونکہ اسے جھٹلانا ممکن نہیں۔ بلکہ اگر یہ غلط نہیں ہوسکتا تو یہ بے معنی ہے۔

دوسری طرح جان ہک ای ایس ماسکل فریڈرک فیرے ڈاکٹر رے برنے' ایس ہیم بیک' سینٹ اینسلم' ایف سی کاپلیسٹن وغیرہ نے مذہبی زبان کی بے معنویت کے حوالے سے نظریات پیش کیے ہیں۔

جان ہک نشاندہی کرتا ہے کہ تصدیق کا نظریہ بذات خود کسی بھی طرح سے واضح اور متعین نہیں ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ وجود خدا کی توثیق کی نوعیت کے بارے میں کچھ نکتہ نظر قابل توثیق ہوں۔ جبکہ دوسرے نکتہ ہائے نظر میں نہیں۔ تصور توثیق کا مطلب کسی مفروضے کی صداقت کے حوالے سے جہالت یا غیر یقینی پن کا خاتمہ ہے۔ کسی جواب کا جواب اس طرح دینا کہ منطقی شک کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ توثیق ایک خالصتاً منطقی تور سے زیادہ ایک منطقی نفسیاتی تصور ہے۔ وہ اصول توثیق کو ترمیم شدہ

صورت میں قبول کرتا ہے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ ''خدا موجود ہے''۔

اپنی کتاب وجود خدا کے دیباچے میں جان ہک لکھتا ہے کہ ذہن مختلف غیر موجود انواع کے تصورات تشکیل دینے کے لیے آزاد ہے، اور کسی ایک تصور کی پڑتال کر کے یہ بتانا ناممکن ہے کہ آیا اس کا جواب دینے والی کوئی ماورائے ذہنی ہستی موجود ہے یا نہیں۔ صرف تجربہ ہی اس کا تعین کر سکتا ہے۔

ای ایس ماسکل نے کہا کہ انسان زبان کا استعمال اس لیے کرتا ہے کہ کیونکہ وہ ایک ذہین اور سماجی ہستی ہے۔ دینیات کی استعمال کردہ زیادہ تر زبان کسی بھی متعلقہ اعتبار سے اس عام وعظ سے اختلاف نہیں کرتی اور نہ ہی کوئی خصوصی مسائل اٹھاتی ہے۔ اس نے کہا کہ معنویت مطلب سمجھنے کی استعداد ہے۔ اور کسی بیان یا تصور یا معنی ہونے یا نہ ہونے کو جاننے کے لیے صرف یہ دیکھنا ضروری ہے کہ لوگ اسے سمجھ رہے ہیں یا نہیں۔

فریڈرک فیرے اپنی کتاب ''زبان' منطق اور خدا' میں کہتا ہے کہ دینیاتی مکاشفہ جوابی اہمیت کی کرداری خصوصیت رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ زبردست قوائیت کی علامتوں کے ساتھ نمٹتے ہیں خود الفاظ یا فقرے نہیں بلکہ دینیاتی تقریر کے الفاظ اور فقروں کا قافیہ اس زبان کے شارح کی سب سے بڑی خصوصیت ہیں۔ ''خدا'' کی تعریف میں انسانی تجربات کا حوالہ لازمی طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روایتی دینیات کسی بھی تعریف میں ہمیشہ اس سے زیادہ پر اصرار کرے گی۔

ہیم بیک نے اپنی مفصل کتاب ''دینیات اور معنی: مابعد دینیات تشکیکیت پر تنقید'' میں کلاسیکل دینیات کی زبان کی معنویت کے لیے دلائل دیے اور اے جی این فلیو اور آر بی بریتھ ویٹ دونوں کی توثیق پسندی کی کمزوریاں عیاں کی ہیں۔ اس کا اخذ کردہ نتیجہ یہ ہے کہ صحیح اور جھوٹ جاننے کے طریق کار کا موجود ہونا عارفانہ اہمیت کے لیے کافی ہے کہ جھٹلائے جانے کے قابل ہونا معنویت کی کوئی کسوٹی نہیں۔ جبکہ ہو پاپر کے اس نظریے سے اختلاف کرتا ہے کہ جھٹلائے جانے کے قابل ہونا سائنسی نظریات کو غیر سائنسی

نظریات سے ممیز کرنے کی کسوٹی ہے۔ ای ایس ماسکل کہتا ہے کہ کوئی بھی لسانی بیان اپنے ذریعے بیان کردہ حالت کی پیچیدگی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام بیانات ایک ہی جتنے غیر معقول ہیں کہ ہماری کہی ہوئی بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ بلاشبہ وہ سب غیر معقول ہیں لیکن کچھ دوسروں کے ساتھ مقابلہ میں کم غیر معقول ہیں۔ چنانچہ اصطلاح ''خدا'' کی تصریح وتوضیح میں ہم چاہے کچھ بھی کہنے کی کوشش کریں لیکن معاملے کی فطرت میں کوئی نہایت اہم بات غیر بیان شدہ رہ جائے گی۔

نتیجہ بحث

سائنس اور استدلال کے اس دور میں جب ہم خدا کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم دنیا کے کسی بھی خالق کی تلاش میں نہیں ہوتے۔ نہ ہی ہم کسی اخلاقی قانون دہندہ کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ہمارا تو رخدا ارتقاء کے ان مراحل سے آگے گزر آیا ہے اور کائنات کی لامحدودیت جیسا وسیع بن گیا ہے۔

ہمارے پاس یہ احساس ہے کہ کوئی چیز ہمارے ادراک، علم اور تخیلات سے ماورا موجود ہے۔ ہمارے تمام خیالات وتصورات کے ساتھ ایک لامحدود کا احساس قریبی طور پر وابستہ ہے۔ کسی شے کا کوئی بھی محدود ادراک یا تصور اپنے ساتھ ایک ماورائیت کا احساس دلاتا ہے، لامحدود کا ایک ادراک، یا کوئی ابدی چیز، جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کائنات میں ہر جگہ حاضر مادے کا کوئی آغاز ہے نہ انتہا کیونکہ ہم زمان یا مکان میں اس کی حد نہیں جانتے۔ پانی کے ایک قطرے کو ہی لیں جو محدود ہے، لیکن لامحدود ایٹموں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ پانی کا ایک قطرہ بیک وقت محدود بھی ہے اور لامحدود بھی۔ چاہے ہم اس لامحدود کو خدا کہیں یا علت اول، ہماری مراد اسی لامحدود ابدی اور ناقابل تبدیل جوہر سے ہوگی۔ ذہنی کے ساتھ ساتھ تمام طبعی صورتیں بھی محض خدا کا اظہار ہیں، جیسے سایہ کسی شے کی صورت ہوتا ہے۔ اس لامحدود اور ابدی خدا میں سے ہم وجود میں آئے ہیں اس میں ہم زندہ ہیں۔ اور اپنے مظہراتی وجود کے اختتام پر اسی میں واپس جائیں

گے۔

خداوہ ہے جس میں سے تما جاندار اور بے جان اشیاء معرض وجود میں آئیں؛ جس میں وہ سمندر کی لہروں کی طرح زندہ رہتی ہیں اور کھیلتی ہیں۔ اورانجام کار جس میں واپس لوٹتی ہیں...... جان لو کہ وہی خدایا محدود جوہر ہے۔ جیسے کوئی تصویر پس منظر کے بغیر نہیں ہوسکتی اسی طرح لامحدود جوہر یا خدا کا سہارا لیے بغیر مظہر موجود نہیں ہوسکتا۔ انفرادی روح 'اور وہ روح جو کائنات کے پیچھے رہنما اور حاکم موجود ہے۔ وہ خدا ہے۔

روح بذات خود خدا ہے۔ ہم خدا کو باہر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن خدا ہمارے اندر ہے میں وہ ہوں اور وہ میں۔ بقول بلھے شاہ "اللہ شہ رگ تھیں نزدیک" یعنی خدا شہہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ اگر ہم ذہن وروح کی تمام تر توانائی کو اپنے اندر موجود لامحدود کی طرف یک سو کرسکیں تو تب ہم روح الارواح کو محسوس کرنے کے قابل ہوں گے' اور تبھی وجود خدا کی صداقت ہم پر منکشف ہو گی۔ جیسے یہ دنیا کے عظیم روحانی رہنماؤں عیسیٰ اور بدھ پر ہوئی تھی۔

☆☆☆

۹ :: خدا اور دنیا

خدا یا قادر مطلق کا تصور مذہب کا سب سے زیادہ اہم ہمہ گیر اور مرکزی تصور ہے خدا اعلیٰ ترین حقیقت' اعلیٰ ترین قدر اور اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ خدا اور دنیا کے درمیان غیر معلوم زمانوں سے زیر بحث ہے۔ اا ہم سوال پر بحث کے انداز نے مندرجہ ذیل نظریا ت کو جنم دیا۔ توحید' توحید ناقص یا وحدت الوجود' لحدیت' لاادریت' اور فطرت پرستی] اب ہم ان نظریات پر باری باری بات کریں گے۔

توحید

یہ نظریہ کہتا ہے کہ خدا دنیا سے الگ وجود رکھتا ہ۔ وہ دنیا سے مکمل طور پر باہر یا ماورا ہے۔ انگلش میں توحید کا مطلب Deism ہے یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظ Deus سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ خدا نے دنیا تخلیق کی اور اس کی تخلیق کے بعد خدا اور انسان کے درمیان کسی تعلق کا امکان رد کر دیا۔

توحید پرست کا ایمان ہے کہ خدا خود علتی ہے کائنات کی علت اول جس نے دنیا کو عدم میں سے تخلیق کیا ایک مخصوص زمانے میں اپنے ارادے میں سے بنایا۔ تخلیق کے بعد دنیا ثانوی علتوں (یعنی خواہشات' قوتوں اور توانائی) کے ساتھ اس سے آزاد ہو گئی۔ خدا دنیا کے نگران اور محافظ کے فرائض بھی سرانجام دیتا ہے۔

خدا کا وجود زمان و مکاں سے ماورا ہے۔ توحیدی تصور خدا یہی ہے کہ ہماری دنیا خدا سے باہر ایک آزاد حقیقت ہے۔ اور یہ کہ انسان کے ارادے مکمل آزادی رکھتے ہیں۔ تاہم مخصوص مواقع پر دنیا اس پر تکیہ کرتی ہے اور اس کی مداخلت ضروری ہوتی ہے۔ خدا اور دنیا کے درمیان تعلق کا اشارہ گھڑی ساز اور اس کی بنائی ہوئی گھڑی والی تشبیہہ سے ملتا ہے۔ جب گھڑی ایک مرتبہ بن چکے تو گھڑی ساز کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے اپنی تخلیق کے ساتھ خدا کے تمام تعلقات اوقت ختم ہو

گئے جب اس نے دنیا کو بنالیا۔

مغربی فلسفیوں' جان ٹولینڈ' میتھیو ٹنگل اور ٹامس کب نے سولہویں اور سترھویں صدی کے دوران اس نظریہ کی حمایت کی ۔تاہم یہ نظریہ کامل نہیں اور سبھی نے اسے قبول نہی کیا۔

تنقید

(۱) تخلیق کادور اور مقصد سمجھنا مشکل ہے۔توحید پرستی کے مطابق خدا نے اس دنیا کوایک مخصوص زمانے میں تخلیق کیا۔لیکن ہم اس کی تخلیق کا دور اور مقصد متعین نہیں کر سکتے۔

(۲) توحید پرستی کے مطابق خدا نے یہ دنیا عدم سے تخلیق کی جو کہ منطقی طور پر غیر متناسب بات ہے۔منطق کہتی ہے کہ عدم میں سے کچھ بھی وجود میں نہیں آیا۔

(۳) اس میں خدا اور دنیا کے مابین ایک دوئی شامل ہے۔یہ واضح طور پر نہیں بتایا گیا کہ خدا حقیقی ہے یا دینا دونوں بیک وقت حقیقی نہیں ہو سکتے۔

(۴) یہ منطقی اعتبار سے غیر محفوظ ہے کیونکہ کچھ فلسفی کہتے ہیں کہ خدا خود مختار ہے اور اس دنیا سے آزاد ہے اور پھر کچھ دیگر کے مطابق یہ دنیا ہی ہے جو مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ہے۔

(۵) یہ اس بارے میں کچھ نہیں کہتا کہ خدا اور دنیا کے مابین کیا تعلق ہے۔اگر ایک لامحدود اور حقیقی ہے تو دوسرا محدود اور حقیقی تو کوئی تعلق کیسے موجود ہو سکتا ہے؟

(۶) مزید برآں خدا نے دنیا کو بنانے کے بعد اسے ثانوی علتوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیا۔ چنانچہ خدا خارجی اور اس دنیا سے باہر ہے۔ یہ بات انسان کے مذہبی رویے میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔یہ روحانی طور پر بھی ناکافی ہے۔

توحید ناقص یا وحدت الوجود

Pantheism (یعنی وحدت الوجود یا ہمہ اوست) دو یونانی الفاظ Pan (تمام)

اور Theos (خدا) سے مل کر بنا ہے۔ جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ دنیا خدا ہے اور خدا دنیا۔ یہ نظریہ توحید پرستی کا مخالف ہے اور اس کا ایک ردعمل ہے۔ یہ نظریہ خدا کو دنیا میں قطعی طور پر نافذ سمجھتا ہے۔

نظریہ وحدت الوجود کی رو سے خدا اور دنیا بنیادی طور پر ہم وجود ہیں اور خدا ان تمام چیزوں میں رچا بسا ہے۔ جن سے مل کر دنیا بنی ہے۔ دنیا کے بغیر خدا ایک بے خاصیت جوہر اور خدا کے بغیر دنیا ایک مطلق نیستی ہے۔ ہر چیز ہر واقعہ ہر ذہن اور ہر ذہنی وظیفہ سب خدا ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نہ صرف یہ کہ خدا تمام وجود میں حاضر ہے۔ بلکہ وہ واحد حقیقت ہے۔ اگر خدا یکتا اور واحد حقیقت ہے۔ اور خدا کے سوا کچھ موجود نہیں تو ساری تکثیریت (Multiplicity) محض ایک غیر حقیقی اظہار بن جاتی ہے۔

سپنوزا کے خیال میں خدا موہر ہے اور جوہر خدا۔ ی جوہر واحد مطلق روحانی حقیقت ہ۔ سپنوزا کی مانند عینیت پسندی کی ہیگلی صورت اپنے کردار میں وحدت الوجودی ہے۔ ہیگل حقیقت کو مطلق ذہن یا ارادے کے طور پر خیال کرتا ہے۔ مطلق سے باہر کچھ بھی نہیں اور سب کچھ مطلق ہے۔ خدا لامحدود اور ہر جگہ موجود ہے۔

خدا کی طرح دنیا بھی بے آغاز اور زمان و مکاں سے غیر محدود ہے۔ المختصر خدا کائنات کے ساتھ ہم وجود ہے۔

تنقید

(۱) اگر خدا حقیقی اور غیر محدود ہے تو دنیا حقیقی نہیں ہو سکتی۔ جب دنیا محدود اور عارضی ہو تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خدا دنیا ہے اور دنیا خدا۔ دنیا اور خدا بالعین نہیں ہو سکتے۔

(۲) اگر ہمارا ایمان ہے کہ سب کچھ خدا ہے اور خدا سب کچھ تو دنیا میں مسئلہ شر موجود نہ ہوتا۔ اگر خدا دنیا ہے تو اس میں بھ کچھ برائیاں اور نقائص ہیں۔ اور کوئی بھی شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔

(۳) وحدت الوجود کے مطابق اگر خدا محیط کل ہے اور اگر وہ دنیا کے اندر ہے تو

خدا حقیقی ابدی اور لامحدود کیسے ہے۔اس نظریے میں ان باتوں کی وضاحت نہیں ہوتی۔

(۴) یہ نظریہ علت اور معلول کے درمیان امتیاز کو نظر انداز کر جاتا ہے۔جو کہ ایک منطقی غلطی ہے۔

(۵) وحدت الوجود کہتا ہے کہ خدا حقیقی اور خود مختار ہے۔اس سے اشارہ ملتا ہے کہ محدود ذات کوئی آزادی اور خود مختاری نہیں رکھتی یوں ذات کی نوعیت اور اخلاقیات پر ضرب پڑتی ہے۔

(۶) آخر میں یہ کہ نظریہ وحدت الوجود معاشرے میں مذہبی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ وحدت الوجود میں خدا شخصی ہستی ہے۔ چنانچہ مذہبی سرگرمیوں کے لیے انسان اپنی ایک ممتاز شخصیت بھی رکھتا ہے۔لہذا یہ اطمینان بخش اور محفوظ نظریہ نہیں ہے۔

خدا پرستی

خدا پرستی کا نظریہ توحید پرستی اور وحدت الشہود سے کافی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ یہ خدا کو بیک وقت محیط کل اور ماورا دونوں سمجھتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ہیگل کے نام سے منسلک ہے اور اس کا مطلب ہے کہ سب کچھ خدا میں ہے۔اس نظریہ کے مطابق دنیا خدا کی ہر حرکت میں ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔اور نیدا کے اساتھ قریبی طور پر مربوط ہے۔ چنانچہ خدا دنیا میں محیط کل ہ۔مزید یہ کہ ہر کچھ خدا میں ہے۔لیکن یہ سب خدا نہیں۔لہذا وہ دنیا سے ماورا ہوا۔خدا دنیا میں محیط کل ہوتے ہوئے بھی اس سے ماورا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد ہیگلی عینیت پسندی کی ٹھوس مابعد الطبیعیات پر ہے۔ہیگلی عینیت پسندی لامحدود اور محدود' خدا اور دنیا کے مابین تعلق کو نامیاتی Organic نکتہ نظر سے دیکھتی ہے۔وحدت الشہود خدا کو اعلیٰ ترین شخصیت' خالق' دنیا کو قائم اور محفوظ رکھنے والا کہتا ہے۔

خدا پرستی کی اصطلاح میں بالکل انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہے جن معنوں میں توحید پرستی۔خدا محدود ہوتے ہوئے بھی تمام خصوصیات سے متصف ہے' یعنی خالق دنیا

کا محافظ اور قائم رکھنے والا۔ دنیا کے ایک ساتھ خدا کے محیط کا کل تعلق میں زمان و مکاں بھی خدا کے اندر شامل ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنی مطلقیت میں وہ زمان و مکان سے ماورا ہے محفوظ طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظریہ تقریباً تمام دیگر نظریات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس خدا پرستی کی حمایت کرنے والے مغربی فلسفیوں میں ڈیکارٹ لاک' برکلے' جیمز وارڈ' ہیگل وغیرہ شامل ہیں۔

تنقید

(۱) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا محیط کل اور ماورا دونوں کیسے ہوسکتا ہے؟ منطقی اعتبار سے یہ بات غیر متناسب ہ۔

(۲) اس میں توحید پرستی اور وحدت الوجود دونوں نظریات کے نقائص شامل ہیں۔ اگر خدا تمام چیزوں میں ہے تو پھر خدا تمام چیزوں سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

(۳) یہ نظریہ خدا اور قادر مطلق کے مابین امتیاز نہیں کرتا کیونکہ یہ قادر مطلق کی طرف سے مطلق ماورائیت پر یقین نہیں رکھتا۔

(۴) اس نظریہ میں خدا اور مکاں کے اندر اور ماورا موجود نہیں ہوسکتا۔ یہ بات ایک منطقی تضاد ہے۔

(۵) یہ ثنائی مفہوم پر زور دے کر مذہبی مشکلات بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ نظریہ ارادے کی آزادی مہیا نہیں کرتا۔ اور نہ ہی خدا کو تمثل کرتا ہے۔

(۶) یہ نظریہ انسانی تفہیم سے ماورا ہے۔ یہ خدا کو سمجھنے کا ایک صوفیانہ اور غیر منطقی طریقہ ہے۔ یہ نظریہ منطقی ذہن کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔

تاہم خدا کا توحیدی تصور مختلف مذہبی روایات کے ساتھ بہترین مطابقت کا حامل ہونے کے باعث مذہبی فلسفیوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ خدا پرستی یا وحدت الشہود تینوں نظریات میں سے بہترین لگتا ہے۔

ملحدیت

ملحدیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی خدا موجود نہیں' یا اگر موجود بھی ہے تو وہ کسی بھی حوالے سے انسانی وجود پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس تصور کی حمایت میں منطقی فہم اور علم سائنسی ترقی اور مادیت پسندانہ نظریات پر مشتمل ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ ملحدانہ نظریہ یہ ہے کہ جن سوالات کے جوابات خدا کے حوالے سے دیے جاتے ہیں۔ اب ان کے جواب سائنسی علم کے حوالے سے دیے جاسکتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر انسانی تاریخ میں مذہبی ایمان کا کردار خدا کے واقعاتی وجود سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اس نظریے کی فلسفیانہ بنیادیں کافی حد تک اس کی منطقی فہم عطا کرتی ہیں جو کچھ ہم مافوق الفطرت تصورات سے آزاد نظام کے ذرائع سے دنیا کے بارے میں جانتے ہیں مادیت پسند فلسفیوں کے مطابق خدا اور دنیا کے حوالے سے ہمارا علم اور تجربہ مادی اشیاء کے علاوہ اور کسی چیز پر مشتمل نہیں۔ خدا کی فطرت کے بارے میں ابھی تک توحید پسند فلسفیوں کی جانب سے کوئی تسلی بخش نظریہ نہیں پیش کیا گیا۔ اپی کیورس کے قدیم دور سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے برٹرینڈ رسل اے جے آر' شلک' کارنپ وغیرہ جیسے مفکرین نے استدلال پیش کیا ہے کہ خدا کے نظریہ میں تضادات اور پیراڈاکسز (Paradoxes) موجود ہیں۔

آرنلڈ ٹائن بی لکھتا ہے کہ تمام مذاہب نے اپنے سابق پیروکاروں کے دلوں اور ذہنوں پر اختیار کھویا ہے۔ کارل مارکس نے مذہب کو معاشی استحصال کا ایک آلہ خیال کیا ہے وہ بتاتا ہے کہ "انسان مذہب کو بناتا ہے مذہب انسان کو نہیں۔ مذہب کچلی ہوئی مخلوق کی علامت ہے بے دل دیا ک ادل عین اسی طرح جیسے ایک بے روح حالت کی روح یہ لوگوں کی افیون ہے......"۔

نٹشے' فرائیڈ اور دیگر کے بنائے ہوئے نفسیاتی نظریات کہتے ہیں کہ مذہبی اعتقادات مخصوص انسانی ضروریات کا نتیجہ ہیں۔ والٹر کوف مان نے نشاندہی کی ہے کہ "خدا اور

تصورات اس دنیا میں موجود سب کچھ سے انسانی عدم اعتماد کی پر زور یاد دلاتے ہیں ......"۔

امریکہ کے دو عیسائی ملحدین ٹامس جے جے الٹائزر اور ولیم ہیملٹن (جنہوں نے خدا کی موت کی بات کہی) نے انجام کا دعویٰ کیا کہ جدید انسان خدا کے بغیر اچھی طرح زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور خود کو اس کے وجود سے متعلق مشکلات میں نہیں پھنساتا۔

اسی طرح ہندوستان کے قدیم مادیت پسند فلسفی "چارواک" خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ خدا کے وجود کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت انہوں نے صرف مادے کو حقیقی سمجھا۔ چنانچہ مادی دنیا میں خدا غیر موجود ہے۔

تنقید

(۱) دنیا کی تخلیق اور خدا کو سر دست نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کائنات کی تخلیق کرنے والا کوئی خالق ضرور موجود ہے۔

(۲) جدید دنیا میں سائنسی ترقی ہو جانے کے باوجود لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اور دنیا کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ان کے دلوں کی عمق میں موجود ہے۔

(۳) دنیا محض مادہ یا اشیاء نہیں یہ روح اور تصورات بھی ہے' جیسا کہ وحدت پرستوں اور عینیت پسندوں کا خیال ہے۔

(۴) انسان مختلف ضروریات رکھتا ہے۔ ایک انسان بنیادی ضروریات تعیّشانہ ضروریات' خیالی ضروریات اور غیر ضروری ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری مادی ضرورت بالکل خدا جیسی نہیں ہوتی۔ تاہم انسان کو خدا کی ضرورت ہے۔

مختلف مفکرین اور فلسفیوں نے خدا کے موجود نہ ہونے کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ لیکن ان کے دلائل جانبدارانہ اور محض بحث برائے بحث ہیں۔ وہ خدا پرستوں کے مذہبی تجربات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

لا ادریت یا مادہ پرستی

Agnosticism (لا ادریت) کا لفظی مطلب Not-Know-ism ہے۔ یہ نظریہ خدا کے وجود کی توثیق یا تردید کے لیے کافی استدلال نہیں رکھتا۔ لا ادری نظریہ میں ہکسلے، سپنسر، ڈیوڈ ہیوم اور والٹیر نے عمیق غور و فکر پیش کیا۔ لا ادری مطلق جواہر، علتوں، روح وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

ادریت کی اصطلاح سب سے پہلے ہکسلے نے استعمال کی، لیکن یہ ہربرٹ سپنسر کے نام سے منسوب ہوگئی۔ اس لفظ کی ایک یونانی شکل کا مطلب ہے "علم کے بغیر"۔ سپنسر کا عقیدہ تھا کہ مطلق علم ناممکن ہے۔ تمام علم نسبتی ہے اور مادے، حرکت، قوت اور شعور جیسی حقیقتوں سے مزید آگے نہیں جا سکتا۔ اور یہ سب چیزیں محض ناقابل معلوم کی علامتیں یا وسیلے ہیں۔

ہکسلے نے اس لفظ کو مذہبی مفہوم میں اپنے اس یقین کی نشاندہی کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کہ چاہے ہم خدا کے وجود سے انکار نہ کریں لیکن ہم اس کی حقیقی فطرت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔

ہیوم متشکک فلسفی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے یقین خیال آرائی تجسس یا صداقت کے لیے خاص محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا منبع مسرت کے لیے شدید خواہش، آئندہ تکلیف کا خوف، موت کی دہشت، انتقام کی پیاس، کھانے کی اشتہا اور دیگر ضروریات میں ہے۔ چنانچہ ہیوم کے مطابق یہ شرط مقدم ثابت نہیں کر سکتے کہ خدا لازماً موجود ہے۔ نہ ہی ہم خدا کا وجود اکی اپنی فطرت کے لازمی نتیجے کے طور پر ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ وہ فطرت کیا ہے۔

تنقید

(۱) اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مخصوص چیزیں آنے والے تمام وقتوں کے لیے ناقابل معلوم رہتی ہیں۔ یہی معاملہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی

فطرت کو جاننا بہت مشکل ہے۔

(۲) ہیوم، ہربرٹ سپنسر وغیرہ نے اپنے نفسیاتی جذبات و احساسات کے ساتھ خدا کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے خدا پر اپنے استدلال یا منطقی استعداد کا استعمال نہیں کیا۔

(۳) تمام لاارادی فلسفیوں نے مادے اور معروض کے حوالوں سے خدا پر غور کیا ہے جو کہ زمان اور مکان کے اندر ہیں۔ لیکن خدا مابعد الطبیعیاتی اور زمان و مکاں سے ماورا ہے۔ چنانچہ ہمارا خدا کا مشاہدہ موضوعی ہونا چاہیے نہ کہ معروض۔ شاید ہیوم کا علم صرف مظہراتی حلقے تک محدود تھا۔

(۴) لاادری نظریہ میں ذہن، روح اور خدا وغیرہ جیسی مطلق حقیقتیں ناممکن ہیں۔ یہ علم انسانی تجربے سے ماورا نہیں جیسا کہ مختلف اولیاء کے مذہبی تجربات کافی بہتر طور پر خدا کا وجود اور فطرت ثابت کر سکتے ہیں۔

(۵) ہیوم ہمیں مطلق حقیقتوں کے مسائل کا تسلی بخش حل دینے میں ناکام رہا ہے۔ وہ اپنی تجربی اور مابعد الطبیعیاتی سطوحات میں یک رنگ نہیں ہے۔

فطرت پرستی

فطرت پرستی کا نظریہ فطری قوانین کی بنیاد پر ہمارے اردگرد تمام مظہر کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ فطرت بذات خود حقیقت مطلق ہے۔ یہ فطرت کی وضاحت حرکت، توانائی، اور فطری قوانین کے ذرائع سے کرتا ہے۔ فطرت پرستی کا نظریہ ہمارے مطالعہ فطرت اور تجربہ میں سے اٹھنے والے کسی بھی تصور کے استعمال کی اجازت دیتا ہے نہ کہ محض طبعی سائنس کے تصور کی۔

فطرت پرستی مادے کے سائنسی اور توانائی کے قوانین تک ہی محدود نہیں۔ نہ ہی یہ ایسا نظریہ ہے جو مادیت پرستی میں سے پیدا ہوا ہے۔ یہ کائناتی سائنس کا ایک مابعد الطبیعیاتی نظریہ۔ فطرت اور فطری قوانین کا تجربہ کرنے کے لیے ہمیں فطرت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کا مشاہدہ اور تجربہ اس نظریہ سے خدا یا روح کو خارج نہیں کر دیتا۔

یہاں فطرت کے روحانی پہلو کے ساتھ ہمارا زیادہ تعلق ہے کیونکہ فطرت کا سائنسی نظام حقیقت کا مددومعاون نہیں ہوتا۔

لاادری فطرت پرستی کی تعریف جیمز وارڈ نے قابل تعریف انداز میں بطور ''مادے کے بغیر مادیت پرستی'' کے کی۔ بہرصورت انسانی شعور میں روحانی اقدار اور مقصد اس دنیا میں حقیقی ہیں۔

ہنری برگساں ،نٹشے ' ولیم جیمز ' جان ڈیوی جیسے اور دیگر فلسفیوں نے خالصتاً فطرت پسندانہ حوالوں سے حقیقت کی فطرت کے متعلق عمومی نظریات تشکیل دینے کی کوشش کی ' اور یوں سائنس کی فراہم کردہ بصیرتوں کو مابعد الطبیعیاتی نظریات تک پہنچایا۔

ولیم جیمز اپنے مشہور مضمون The will to believe میں دلیل دیتا ہے کہ خدا کا وجود یا عدم وجود جس کا کوئی بھی فیصلہ کن ثبوت نہیں ہوسکتا' اس قدر وقیع اہمیت کا معاملہ ہے کہ جو کوئی بھی خواہش کرتا ہے اسے خدا کے مفروضے پر اپنی زندگی داؤ پر لگانے کا حق حاصل ہے۔

تنقید

(۱) فطرت پرستی سائنسی قوانین کی بنیاد پر تمام فطری مظہر کی وضاحت کرتی ہے۔ لیکن قوانین فطرت یا کائنات کو شامل نہیں کرتی۔

(۲) فطرت پرستی مادیت کی ترمیم شدہ صورت نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مادیت پسندی میں مادہ حقیقی ہے۔ لیکن فطرت پرستی میں فطرت حقیقی ہے۔

(۳) فطرت پرستی فطرت کا کوئی قطعی مفہوم فراہم نہیں کرتی۔ تصورفطرت کی بنیاد کے متعلق وضاحت کا فقدان ایک پرزور اعتراض ہے۔

(۴) فطرت پرستی حرکت اور توانائی پر زیادہ توجہ دیتی ہے لیکن فطرت یا روح پر نہیں۔

(۵) یہ نظریہ کسی بھی شخص کے مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی تجربات کی وضاحت کرنے میں ناکام ہے۔ جو کہ زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(۶) فطرت پرستی کا یہ نظری فلسفیانہ اعتبار سے غیر موافق اور غیر محفوظ ہے کیونکہ یہ سائنسی قوانین اور دریافتوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا ہے۔

نتیجہ بحث

ہم نے توحید، وحدت الوجود، خدا پرستی، ملحدیت، لاادریت اور فطرت پرستی کے نظریات کی مدد سے خدا اور دنیا کے مابین تعلق پر بحث کی ہے۔ تاہم ثنائیت غیر ثنائیت اور مشروط غیر ثنائیت پر غور کیے بغیر یہ بحث ادھوری رہے گی۔

ہندوستان میں مفکرین ایک ماورائے دنیا شخصی خدا پر یقین رکھتے ہیں جو تمام شفیق خصوصیات کا حامل ہے، جو محیط کل ہے، علیم و خبیر ہے جو محبت کرنے والا ہے، جس نے کائنات عدم میں سے نہیں بلکہ فطرت کے ازلی مسالے سے تخلیق کی ہے خدا کائنات کی مستعد علت ہے اور فطرت اس کی مادی علت۔ وہ اس بت پر یقین نہیں رکھتے کہ روح اچانک ہی وجود میں آ گئی بلکہ یہ ماضی میں موجود تھی اور ازل سے ابد تک مستقبل میں موجود رہے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح روح کل ازلی ہے اسی طرح انفرادی روح بھی ہر ایک روح بالقوہ کچھ عرصے تک فطرت میں موجود رہنے کے بعد تخلیق یا ارتقاء کا ایک نیا دور شروع ہونے پر رلتی حالت سے برآمد ہوتی ہے۔ اور ان گھڑ صورتوں میں خود کو منکشف کرتی ہے ہندوستان میں ثنائی (دوویت) نظام فکر کے مطابق انسانی روح فطرت کے ایک لامحدود ذرے جیسی ہے جو لامحدود حد تک چھوٹی سطح پر ذہانت کی الوہی تابانی اور الوہی قوت پر مشتمل ہے۔ جس کا فرض عبادات، اچھے اعمال، اچھے خیالات اور محبت کے ذریعہ خدا کی خدمت کرنا ہے۔ خدا سب سے محبت کرتا ہے اور جواب میں اسے محبت کی جا سکتی ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ہر روح خدا اور دیگر ارواح سے الگ ہے۔ تاہم خدا کے ساتھ اس کا رشتہ سورج سے شعاع اور آگ سے چنگاری کے رشتے

جیسا ہے۔

خدا کے ثنائی تصور کے بعد مشروط غیر ثنائیت کا تصور آتا ہے۔ یہ مفکرین ثنائیت پسندوں کی نسبت زیادہ گہرائی تک گئے۔ انہوں نے حصول صداقت اور خدا کے ساتھ انسانی تعلق کو سمجھنے کی جانب ایک قدم اٹھایا۔ ان کے مطابق خدا ماورائے کائنات نہیں اور نہ ہی کائنات سے باہر اور الگ ہے بلکہ وہ کائنات میں محیط ہے خدا باہر بیٹھا ہوا حاکم نہیں بلکہ اندرونی حاکم ہے۔ وہ محیط کل دنیا سے ماورا ہے۔ خدا دنیا کی مستعد علت کے ساتھ ساتھ مادی علت بھی ہے خدا کی تخلیق کردہ دنیا بھی خدا جتنی ہی حقیقی ہے لیک دنیا خدا پر منحصر ہے اور کوئی آزاد وجود نہیں رکھتی۔ دنیا ایک سراب نہیں۔ سب کچھ خدا نے تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ ذات ''نفس'' بھی خدا جتنی ہی حقیقی ہے۔ انفرادی روح خدا کا جزو لاینفک ہے اور ابدی و حقیقی ہے۔ انفرادی ذات مجسم کردہ روح ہے۔ ہر انفرادی روح خدا میں سے نکلی ہوئی چنگاری ہے لیکن اسے خدا نہیں کہا جا سکتا۔ خدا ہر کہیں مقیم ہے۔ وہ کائنات اور فطرت میں محیط ہونے کے باوجود ان دونوں سے ماورا ہے۔ وہ غیر محدود لیکن شخصی ہے۔ کسی انسانی صورت کے بغیر مشروط ثنائیت پسند کہتے ہیں کہ خدا کو کسی ایک صورت میں محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر صورت زمان و مکان میں ایک تحدید ہے۔ پھر بھی وہ اپنے عبادت گزاروں کی خواہشات کو تسکین دینے کے لیے مختلف روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارا جسم خدا کے جسم کا ایک حصہ ہے ہمارا ذہن کائناتی ارادے کا ایک جزو ہے۔ اسے خدا کا مشروط غیر ثنائی تصور کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا ایک کائنات اور انسانی ارواح خدا کے ساتھ متحد ہیں؛ تاہم ہر ایک اپنی علیحدہ انفرادیت قائم رکھتی ہے۔ خدا ایک درخت کے مانند ہے اور ہم اس کی شاخوں کی طرح۔ خدا ایک سمندر جیسا ہے اور ہم اس میں اٹھنے والی لہروں جیسے۔

ان کے بعد موحدانہ یا غیر ثنائی مفکرین کا طبقہ آتا ہے۔ وحدانیت کے مطابق حقیقت مطلق واحد اور بلا شرکت غیرے ہے۔ خدا واحد حقیقت ہے اور یہ غیر ثنائی ہے

انفرادی روح اور دنیا خدا کی حقیقی تقلیب نہیں ہے۔وہ خدا کے اظہار ہیں۔نام اور روپ کی دنیا محض خدا کا ایک عکس ہے۔

خدا مادی کائنات کا پیدا قائم اور تباہ کرنے والا ہے۔وہ دائمی ہے' واحد اور خالص شعور وہ محیط کل اور حاضر و ناظر ہے۔

صرف خدا حقیقی ہے دنیا جھوٹ ہے' فرد خدا ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں خدا مابعد الطبیعیاتی طور پر غیر حقیقی اور غلط ہے۔

ثنائیت' مشروط غیر ثنائیت اور غیر ثنائیت کے یہ تینوں نظریات اس دنیا اور اس کی انفرادی روحوں کے لیے ضروری ہیں۔ ایک نظریہ دوسرے کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے بھرپور بناتا ہے۔غیر ثنائیت پسند یا مشروط غیر ثنائیت پسند ثنائیت کو غلط نہیں کہتے۔یہ صحیح نکتہ نظر ہے یہ صداقت کی جانب ایک قدم ہے چنانچہ ہر کسی کو اپنے نظریہ دنیا پر عمل کرنے دو اپنے خیالات کے مطابق۔توحید زندگی کی ایک بلند تر صورت ہے جس میں کوئی خدا' جنم یا موت' دکھ اور تکلیف اچھائی یا برائی اور کوئی نام و صورت موجود نہیں بلکہ وجود علم اور طمانیت ہے۔چنانچہ یہ ثنائیت سے شروع ہوتا ہے مشروط توحید میں سے گزرتا ہے اور کامل توحید پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

☆☆☆

۱۰ :: مذہبی تجربہ

''جو برہمہ کو جان یا محسوس کر لیتا ہے' وہ برہمہ میں سما جاتا ہے''۔

(وید)

ساری انسانی تہذیب کے دوران مذہب انسانی زندگی کا ایک اہم اور غالب عنصر رہا ہے۔ انسانی تاریخ اور زندگی کو سمجھنے کے لیے مذہب کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن مذہب کوئی نظر آ سکنے والی چیز نہیں۔ مذہب کی اور اس کے تجربے کی تفصیل بتانا ایک سائنسی کارنامہ ہے کیونکہ حقائق کو غیر جذباتی اور معروضی طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ ہمیں عوام میں عام طور پر مقبول دکھائی دینے والی باتوں سے آگے جا کر دیکھنا ہو گا۔ اگرچہ مذہبی تجربہ کی صوفیانہ اور دیگر صورتوں سے مافیہ اور کیفیت کی قدر جاننے میں ہمیں مشکلات درپیش ہوں گی۔ لیکن ایک مفہوم میں ہم ان کے ساتھ معروضی طور پر نبٹ سکتے ہیں۔ ایک مذہبی تجربہ میں نظر نہ آنے والی دنیا کا ایک قسم کا ادراک شامل ہوتا ہے۔ یا ایسا کوئی ادراک کہ کوئی نظر آنے والا انسان یا شئے نظر نہ آنے والی دنیا کو تجسیم ہے۔

ہندو مذہبی تجربہ

ہندومت کے اعتقادات اور مذہبی تجربات کو بالکل ٹھیک اور تفصیلی طور پر پیش کرنا ناممکن ہے' کیونکہ اس میں بہت سے مکتبہ ہائے فکر موجود ہیں۔ ہندوستانی تصوف ویدوں اپنشدوں' یوگا وغیرہ پر مشتمل ہے۔

وید

وید ویدانت کا تصور ہندومت کا لازمہ ہے۔ ویدانت کی جڑیں اپنشدوں میں ہیں وید اور اپنشدہی صحیح معنوں میں ہندو مذہب کی بنیاد تشکیل دیتے ہیں۔ الوہی ذات کا ایک تجربہ ہندو مذہب کا مافیہ ہے تلاش حق فلسفہ کا قافیہ ہے۔ تاہم اعلیٰ ترین صداقت منطقی اور علمیاتی درجہ بندیوں کے اعتبار سے ماورائے ادراک ہے۔ یہ ہر ایک کے اندرونی

تجربہ کی گہرائیوں میں میسر ہے۔ ایک صوفیانہ نروان اور تقلیبی احساس ہی ہمیں قیاس استدلال یا فلسفے کے بندھن سے پرے لے جاتا ہے۔ وید اور اپنشد انسانی مذہبی تجربے کی ایسی ہی صورتوں کو مجسم کرتے ہیں۔

ویدوں کی تخلیق بذات خود ایک عارفانہ مظہر ہے کیونکہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ ویدک بھجن عارفانہ تجربے کا نف مضمون ہیں ایندر درمیانی خلا کا خدا ہے۔ اگنی (آگ) زمین کا یہ تین تینتیس ہے اور ہر حلقے میں گیارہ گیارہ دیوتا موجود ہیں۔ رگ وید میں متعدد مقامات پر ایندر کا کائنات کا واحد دیوتا کہا گیا ہے۔ وہ انسان اور فراوانی کا آقا ہے۔

اگرچہ ویدک آریوں نے متعدد خداؤں کی پوجا کی لیکن یاسک کہتا ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ اس ذات واحد کو اولیاء اور بزرگوں نے بہت سے نام دیے۔ انہوں نے اسے اگنی، یم، وایو وغیرہ کہا۔ خداؤں کی عظیم الوہیت یکجا ہے۔ قربان گاہ کے شعلوں میں جلنے والی الوہیت ہی جنگل کی آگ کے طور پر بھی جلتی ہے۔ یہ آسمان پر صاعقہ کی طرح چمکتی ہے اور افلاک کی سورج کی طرح روشنی دیتی ہے۔ یہ حرارت بن کر گندم کو پکاتی ہے سورج کے طلوع وغروب کے طور پر دن اور رات پیدا کرتی ہے۔ بالکل یہی اصول بارش لاتا بجلی کی کوند ظاہر کرتا نباتات اگاتا اور زندگی کو قائم رکھتا ہے۔

ویدک عارفوں کی تعلیمات کا نکتہ عروج ''ایکم ست'' کی حقیقت کے راز میں پوشیدہ ہے۔ ساری کی یا ساری کائنات پر خدا واحد محیط اور غالب ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں بالکل اسی طرح جیسے اتحاد کا تصور دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں موجود ہے۔ چنانچہ ویدک نکتہ نظر حقیقتاً ایک عارفانہ نکتہ نظر ہے۔ جو بہت سوں سے انکار کرتے ہیں ایک کو منکشف کرتا ہے اور جو بہت سوں کے لیے بنیاد ہے۔ ویدک تمثیل کا مقصد بہت سوں جھٹلانا نہیں بلکہ استعمال کر کے واحد کا ادراک کرنا ہے۔

تصوف ویدک مذہب کی عین روح ہے اور اس کو نظر انداز کرنے والی کوئی بھی تعبیر ویدک پیغام کے جوہر سے محروم ہوتی ہے۔ تصوف بذات خود ویدک اقوال کا ایک جوہر

خاص ہے۔

چنانچہ ویدک دھرم مذہبی زندگی کی عیاں اور مخفی دونوں خصوصیات رکھتا ہے۔ اول الذکر بیرونی یا خارجی مذہب جبکہ موخر الذکر اندرونی یا داخلی عارفانہ راہ ہے۔

اپنشد

خداؤں سے لے کر انسان اور اعلیٰ کہ خفیف ترین مخلوق کے ساتھ تمام زندگی کی لازمی یگانگت کا تصور تصوف کا سنگ بنیاد ہے۔ جس پر اپنشدوں میں خصوصاً زور دیا گیا۔ اپنشد ہندوستانی رشیوں اور بزرگوں کے تجربات پر مشتمل ہیں۔

یہ بات جانی مانی ہے کہ اپنشدوں میں ویدک تبدیلی کا آخری دور شامل ہے۔ پہلا دور منتر دوسرا دور برہمن تیسرا دور آرنیک جبکہ اپنشد چوتھا دور اور آخری دور ہے۔ آرنیکوں اور اپنشدوں نے اپنے اندر عارفانہ عناصر کو ترقی دی۔

ہم رگ ویدک بھجنوں میں بھی ادھر ادھر دیوتاؤں کی تکثیریت سے واحد لامحدود کی جانب رجحان کا زور دیکھتے ہیں۔ اپنشدوں میں یہ رجحان زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اور کین اپنشد میں دیوتاؤں کی شکست فاش کی کہانی بہت اچھے طریقے سے پیش کیا گیا ہے چانڈوگیہ اور بریہد آرنیک اپنشد میں بھی ہم لامحدود برہمہ یا آتما کی فطرت اور علم کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اس لامحدود کا ماورا اور محیط کل دونوں کہا گیا ہے۔ بریہد آرنیک اپنشد میں باجناوالکیہ کہتا ہے:

> ''وہ جو زمین میں رہتا ہے اور زمین کے اندر ہے' جسے زمین نہیں جانتی جس کا جسم زمین ہی ہے جو زمین کے اندر سے چلاتا ہے......وہ تمہارا اپنا آپ ہے اندرونی ناظم لافانی''۔

یہ ذکر بھی آیا ہے کہ ہبر ہمہ نظر آنے والا ناظر ہے' نہ سننے والا سامع' غیر متصور مفکر' نامعلوم عالم۔ اس کے علاوہ اور کوئی ناظر نہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی سامع نہیں اس

کے علاوہ اور کوئی متفکر نہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی عالم نہیں۔ وہ تمہاری اندرونی ناظم لافانی ذات ہے۔

پروفیسر آر ڈی ریناڈے کے مطابق اپنشدوں میں بیان کردہ روحانی ترقی کی سیڑھی کے پانچ مراحل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بریہد آرنیک اپنشد کے مطابق پہلی منزل میں متلاشی حق خود کو دوسروں سے الگ سمجھتا ہے اور عارفانہ وجدان کے ذریعہ سے اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

(۲) دوسرے مرحلے میں متلاشی محسوس کرتا ہے کہ وہ حقیقتاً عین ذات ہے اور وہ اپنی لازمی فطرت میں ہو بہو خاص ذات جیسا ہے۔ بریہد آرنیک اپنشد کے مطابق ہمارے اندر خود کو ''میں'' کہنے والی ہستی ذات سے متشابہ ہوتی ہے۔

(۳) تیسرے مرحلے میں وہ جان لیتا ہے کہ اس نے جو ذات محسوس کی ہے وہ برہمہ کے ساتھ عینیت رکھتی ہے۔

(۴) چوتھے مرحلے میں اسے آگہی ہوتی ہے کہ وہ بطور ذات مطلق ہے اور نتیجتاً اس نکتے پر پہنچتا ہے کہ وہ قادر مطلق ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہمیں اپنی ''میں'' کو قادر مطلق کے ساتھ متشابہ بنانا چاہیے۔

(۵) پانچویں مرحلے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمیں نظر آنے والی ہر چیز انسان اور فطرت 'ذات اور لاذات' یکساں ور پر برہمہ یا حقیقت مطلق پر مبنی ہے۔ اس حقیقت مطلق کو پانا محض عقلی نہیں بلکہ عارفانہ ہے۔

مندرجہ بالا عارفانہ تجربہ مندرجہ ذیل نتائج بھی مہیا کرتا ہے

(۱) بریہد آرنیک اپنشد کے مطابق جب کسی شخص کی خواہشات پوری اور ادراک ذات کے بعد مقصد پورا ہو جاتا ہے تو تمام طبعی لگاوٹ اور خواہشات تباہ ہو جاتی ہیں۔

(۲) عارفانہ ادراک تمام شکوک وشبہات کے غائب ہو جانے پر منتج ہوتا ہے۔ منڈوکیہ اپنشد کے مطابق سالک کے دل کی تمام گرہیں کھل جاتی ہیں تمام شکوک ذائل ہو

جاتے ہیں اور کرموں (افعال و اعمال) کے تمام اثرات کارگر نہیں رہتے''۔

(۳) خود آگہی کافی طاقت دیتی ہے اس کی تمام تکالیف دور ہو جاتی ہیں اور وہ روح عام کی لامحدود طاقت میں شراکت داری کرتا ہے۔

(۴) روح عالم کے ساتھ اتحاد مطلق مسرت پر منتج ہوتا ہے تیتریہ اپنشد میں یہ مسرت (آنند طمانیت) تفصیلاً واضح کی گئی ہے۔ کامل مسرت تمام خوف دور کر دیتی ہے۔

(۵) آخر میں خود آگہی کے نتیجے میں تمام خواہشات کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ چانڈوگیہ اپنشد کے الفاظ میں جو اپنی تلاش کے بعد ذات کو پالیتا ہے وہ تمام کائنات کو پاتا ہے اور اس کی تمام خواہشات پوری ہو جاتی ہیں''۔

یوگ

ہندوستان کے مختلف مابعد الطبعیاتی نظاموں میں یوگ مکاتب فکر کا حقیقی موضوع یہیں اور فوری طور پر روحانی اصولوں کے ساتھ انسانی روح کا عارفانہ اتصال حاصل کرنا ہے۔ بیشتر ہندوستانی فلسفوں کی طرح یوگ کے روحانی فلسفہ کا مقصد خدا میں انسان کی جذبیت کے ذریعہ کامل طمانیت کا حصول ہے۔

یوگ کے عام طریق ہائے کار اور ادراک کی یک بعد دیگرے نو منازل پر مشتمل ہیں جو عام انسانی حالت سے کامل اتحاد تک پہنچاتی ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ یم

مادی کائنات کے بارے میں انسانی رویے پر مبنی مادی پاکیزگی کے اصول۔ یہ دس اعلیٰ نیکیوں کی پیروی کرنے پر مشتمل ہیں...... (۱) عدم تشدد (۲) راست گوئی (۳) حرص نہ کرنا (۴) تجرد (۵) رحم (۶) متانت (۷) عفو و درگزر (۸) ذہن پر قابو (۹) کفایت شعاری اور (۱۰) جسم کی طہارت۔

۲۔ نیام

جسمانی اذیت اور مرتاضیت کی کٹھن مشقیں (۲) آقا کی مرضی کی کامل قبولیت (۳) خیرات اور فیاضی (۴) دنیا کے آقا کی عبادت (۵) مقدس کتاب کا مطالعہ ......اور (۶) خدا کے آگے سر تسلیم خم کرنا۔

۳۔ آسن

تیسرا اصول آسن یا جسم کا بیٹھنے کا انداز ہے۔ آسن ارتکاز فکر کے لی ذہین اور جسم کی مدد کرتا ہے۔ پتنجلی الفاظ میں کہتا ہے کہ آسن مضبوط خوشگوار اور آسان ہونا چاہیے۔ خیال کیا گیا ہے کہ آسن جمانے سے مراقبے میں سہولت ہوتی ہے۔

۴۔ پرانایام

سانس کی پاکیزگی۔ یہ سانس لینے کی مشقیں ہیں جن کا مقصد نظام تنفس کو کنٹرول کر کے الوہی قوتوں کے ساتھ اتحاد کے خیال کو واضح بنانا ہے۔ اس میں آہستہ آہستہ اور گہرا سانس لینا' سانس روکنا اور آہستہ آہستہ سانس باہر نکالنا شامل ہے۔

۵۔ پرتیہار

ذہن کا تعلق احساسات اور ان کے معروضات سے ختم کرنا۔ ذہن کو تمام بیرونی تاثرات کے لیے بالکل نا قابل گزر ہونا چاہیے۔

۶۔ دھرم

ذہنی ارتکاز کی مشق حتیٰ کہ ذہن ایک طویل عرصہ کے لیے کسی مخصوص شے پر مرکوز ہونے کے قابل بن جائے۔

۷۔ دھیان

یعنی مراقبہ جو یوگی سادھنا کے نکتہ نظر سے بہت اہم ہے۔ عمیق ارتکاز فکر مراقبہ کہلاتا ہے۔ مراقبہ میں کسی خاص شے پر غیر منتشر اور مسلسل توجہ ضروری ہے یہ اتحاد کی عارفانہ

منزل ہے۔

۸۔ سمادھی

آٹھواں اور آخری اصول ''سمادھی'' یوگ کی منزل مقصود ہے۔ یہ ایک عارفانہ حالت ہے، خدا اور ذات کے کامل اتحاد کی حالت۔ یہ شدید ارتکاز فکر کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ آٹھ اصول (یوگ انگ) اعلیٰ ترین منزل حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔

بھگوت گیتا

یہ کافی حد تک عارفانہ پن اور فعالیت کا امتزاج ہے۔ اس قسم کا امتزاج ہندو مت کی میراث کی کرداری شان وشوکت ہے۔ تصوف کا مافیہ ایک قسم کا انجذاب ہے۔ عمل میں جذب کی کیفیت بے انا سپردگی کے ذریعہ ممکن ہے۔ پرخلوص عمل محض ایک دلچسپی سے عاری عمل سے زیادہ ہے۔ دلچسپی سے عاری عمل زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا اسے ختم ہو جانے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ خلوص کا عارفانہ رنگ اسے الوہی عمل میں تبدیل کر دیتا ہے اس کے اندر ایک ماورائے انسانی طاقت بھر دیتا ہے۔ عارف کو اپنے لمحات انجذاب میں خود کو لامحدود کے لیے کھول دیتاہ۔ وہ خود کو الوہی اثر کا آخذ سمجھتا ہے اور درحقیقت خود ہی الوہیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جب گوتم بدھ کو نروان اور حسین بن منصور حلاج کو انا الحق کا احساس ہوا۔

بھگتی

بھگوگ گیتا کو مختلف طور پر عمل کی تعلیمات خاص کر علم کی تعلیمات اور بھگتی کی تعلیمات کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ بھگتی پر گیتا کا اصرار بہر حال بلاشبہ سب سے زیادہ ہے وہ واضح انداز میں قادر مطلق پرش کے طور پر الوہی حاکمیت پر زور دیتی ہے۔ حقیقت اور مطلق کی بھگتی اس کا بنیادی موضودہ۔ اور راہ عمل کے ساتھ ساتھ راہ علم بھی اسی کے مطابق ترتیب پاتی ہے۔

بھگتی یوگ مقدس قرار دیے گئے ہیں جذبے کے ذریعہ سے اتحاد کی جستجو ہے۔ یہ

محبت کا یوگ ہے عارفانہ مکاتب میں سب سے عظیم۔ یہ اپنی مقرر کردہ قسمت کے ساتھ انسانی محبّ کی ہم آہنگی کے ذریعہ سے اتحاد تک پہنچتا ہے جو الوہی محبت کو تمام تر پاکیزگی میں منکشف کرتا ہے۔

ایک ہونے کا احساس ہندومت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ گیتا میں ایک ہونے کا احساس کیا ہے؟ یہ محبت ہے الوہی محبت اگر ہم واقعی خدا سے محبت کرتے ہیں تو ہم خدا کے ساتھ ایک ہو جائیں گے' اور ہمارے اور خدا کے مابین کوئی فرق یا صلہ نہیں رہے گا۔ ویدیہ بھی کہتے ہیں۔ جو برہمہ کو جان یا محسوس کرلیتا ہے وہ برہمہ میں سما جاتا ہے۔

خدا محبت ہے خالص محبت طمانیت ہے۔ اعلیٰ ترین طمانیت بذات خود الوہیت ہے بھگتی واقعی اپنی ہستی کو مٹا کر خدا میں جذب کر دیتا ہے۔ محبت بھگتی اور خدا ک سامنے سر تسلیم خم کرنے کے ذریعہ وصال خدا کا راستہ سب سے زیادہ آسان ہے۔

خدا کی حقیقی محبت خدا کی عظمت اور جلال کے علم سے حاصل ہوتی ہے۔ جب محبت گہری اور مطلق ہو اگی پر ختم ہوتی ہے تو بھگت پر کدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ یہ بھگتی اور جنان (علم) کو تجربہ خدا تک لاکر ان میں امتیاز ختم کر دیتا ہے۔ اس حالت میں خدا کو جاناان اسے محبت کرنا ہے اور اسے محبت کرنے کا مطلب ہے اسے جاننا۔ یہ تجربہ جب حاصل ہو جائے تو لاعلمی کا بادل ہٹا دیتا ہے۔ اور انسان خدا کا ادراک کرتا ہے۔

جنان

جنان یوگ' راہ علم حقیقت مطلق کے علاوہ ہر چیز کو قبول رکنے سے انکار کر کے حقیقی اور غیر حقیقی کے مابین امتیاز کرنے کے طریقے پر زور دیتا ہے۔ گیتا میں جنان فلسفیانہ مسائل کی عقلی تفہیم کے ساتھ ٹھہر نہیں جاتا۔ یہ بصیرت ہے جو حصول خدا کے ہمراہ ہوتی ہے گیتا میں کہا گیا ہے کہ ہم بھگتی کے ذریعے علم حاصل کر سکتے ہیں۔

لفظ جنان کا مطلب مظہری اور ماورائی علم دونوں ہیں جنان جب اعلیٰ مفہوم میں استعمال ہو تو اس کا مطلب برہمہ کا علم ہے جو زمان مکان اور علیت کے درجوں سے ماورا

ہے۔ شنکر کے مطابق برہمہ کا علم قادر مطلق کی براہ راست آگاہی ہے۔

متمنی کو راہ علم میں یہ جاننا ہوتا ہے کہ دنیا مایا ہے اور صرف برہمہ حقیقی ہے۔ اسے استدلال کے ذریعہ یہ یقین پکا کرنا پڑتا ہے کہ برہمہ کائنات نہیں نہ ہی اس کا ذہن نہ ہی شعور نہ ہی حسیات' نہ ہی رنج والم یا مسرت وغیرہ۔ حتیٰ کہ اس عمل نے ذریعہ آخر کار وہ چیزوں کے جوہر تک پہنچتا ہے اور مطلق کو جانتاہ۔ حقیقت مطلق کو جاننے کے لیے "میں" اور "میرا" کو تیاگنا پڑتا ہے۔ جو روح کے بندھن ہیں۔

گیتا کہتی ہے:

> "صرف علم کی کشتی کے ذریعہ انتہائی گناہگار شخص بھی سمسار کا سمندر عبور کرسکتا ہے۔ جس طرح بھڑکتی ہوئی آگ ایندھن کو راکھ کر دیتی ہے' اسی طرح علم تمام اعمال (کرم) کو راکھ کر دیتا ہے۔ عمل کا نقطۂ عروج علم ہے علم حاصل کرنے کے بعد انسان جلد ہی شانتی یا کامل طمانیت پالیتا ہے۔"

کرما

بھگوت گیتا کا آغاز عمل سے ہوتاہ۔ اور ارجن بنیادی طرو پر مرد عمل نظر آتا ہے جو آزمائش کی گھڑی مٰں شدید بے دلی کا شکار ہے۔ اگر چہ بھگوت گیتا بنیادی حوالے سے عمل کا یا کم کی تعلیم دیتیہے۔ لیکن باریک بین مطالعہ سے پتا چلے گا کہ یہ روحانی ادراک کے نقطۂ عروج تک پہنچتی ہے۔ کیونکہ گیتا میں جس عمل کا درس دیا گیا ہے وہ بے لوث اور کسی پھل کی خواہش کے بغیر عمل ہے۔

گیتا میں شری کرشن کہتے ہیں کہ کام کرنا مرد و عورت کا مقدر ہے۔ راہ عمل یا کرم یوگ بے لوث پر عمل پر منحصر ہے۔ لیکن عمل سے بے تعلق نہیں۔ عمل کیے بغیر انسان ماورائے عمل حالت میں نہیں پا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں عمل ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن ذاتی غرض اور فائدے کو بالائے طاق رکھ کر زندگی کا مقصد خدمت انسانیت ہے نہ کہ خود

پروری خدمت کی نیت سے کیا ہوا تمل بہت اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔لہذا انسان کو چاہیے کہ خودکوخدا کا خادم سمجھ کرمخلوق کی خدمت بجالائے‘ جو کچھ بھی کرے اپنے آپ کوخادم سمجھ کر کرے۔جزا یا صلہ کے لالچ سے قطع نظرعمل کرنے والا انسان معمولی نہیں وہ یوگی ہے عارف ہےمہاتما ہے۔

بدھ مت کا مذہبی تجربہ

بدھ سے نظری اور عملی پہلوؤں کا مطمع نظر روحانی بصیرت حاسل کرنا ہے۔مکتی یا نروان بدھ مت کی حتمی منزل ہے۔گوتم بدھ نے تکلیف اور کرم کے اثرات کے عمل کا سبب زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھا‘اور مراقبہ (دھیان) کے آٹھ مراحل میں سے گزرا۔ مراقبے کے پہلے مرحلہ میں بھکشوکوئی پرسکون جگہ ڈھونڈتا ہے زمین پر بیٹھتاہ اور پھر کسی چیز پر اپنا دھیان لگا دیتا ہے۔یہ چیز کوئی نیلا پھول‘مٹی کا گول ٹکڑا یا ایی ہی کوئی اور شے ہو سکتی ہے۔اس طرح تیار ہوکروہ روپ کے حلق کے چار مراقبوں میں داخل ہوتا ہے جو بےروپ حلقے تک لے جاتے ہیں۔پھروہ آنکھیں بند کرکے اسے تصور کرنے کی کوشش کرتا ہےفرض کریں کہ وہ ایک نیلے پھول کوتصور میں لا رہا ہے۔پھر وہ اسے تمام پیش و پس سے منظر سے جدا کرکے محض نیلےک طور پر زیرغور لاتا ہے۔اس کے بعد وہ آنکھیں بند کرکے اس کا تصور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ی کوشش مخصوص آگہی تک مسلسل جاری رہتی ہے۔لیکن مزید مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کوشش کرنے کا خیال دل میں لائے بغیر مراقبہ کیا جائے۔یہ دوسرا مرحلہ ہے تاہم ماہر کے شعور میں تین عناصر موجود رہتے ہیں اپنی کامیابی پر وجد کا احساس طمانیت اور مسرت۔

روپ (صورت) کی قلمرو کے ان چار مراحل کے بعد بھکشو اعلیٰ تر مراحل میں داخل ہوتا ہے۔پہلے وہ ہر شے کو ایسے خیال کرتا ہے کہ جیسے وہ بےسرحد جگہ ہو پھر وہ دنیا کو واس کی تمام اشیاء سے خالی کر دیتا ہے اور خالی جگہ (Space) کا تصور کرتا ہے۔پھر وہ خارجی حقیقت کا یہ تصور بھی ملتوی کر دیتا ہے حقیقت کو محض شعور پر مشتمل ہونے کے طور

پر خیال کرتا ہے۔ بے شکلی کے تیسرے مرحلے میں وہ اس فارمولے پر دھیان لگاتا ہے کہ...... ''کچھ بھی موجود نہیں'' آخر کار وہ ادراک اور نہ ہی غیر ادراک کی منزل تک پہنچتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر...... یہ شعور کی ایسی قلم رو ہے جو ادراک یا سوچ جیسی نہیں یہ خالص شعور کا وجدانی تجربہ ہے۔ جس کے بارے میں بدھسٹ اولیاء کا یقین ہے کہ وہ نروان کی حالت ہے۔

دھیان لگانا تکنیکوں کی ایک قسم ہے جسے یوگ (یوگا) کہتے ہیں...... ذہنی اور جسمانی قوتوں کو عمل میں لانا۔ بدھسٹ بھکشوؤں کے تمام فرقوں میں دھیان کا وظیفہ ہمہ گیر ہے اور عقائد میں کافی اہمیت حاسل ہے۔ بھکشوؤں کی خاصی بڑی تعداد نے عارفانہ بصیرت کی ایک حالت پائی جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نا قابل بیان ہے۔ آگہی پانے کے بعد گوتم بدھ نے تجربی دنیا کو اس ماورائی حالت کے پرنور تجربہ کی روشنی میں دیکھا جو اسے حاصل ہوئی تھی۔ اسے چشم بینا حاصل ہوئی جس نے اسے زندہ ہستیوں کی حالت میں گہرائی اور وضاحت کے ساتھ دیکھنے کے قابل بنایا۔ تاہم اپنی بعد کی تعلیمات سے جب وہ آگہی کے تجربہ سے پیدا شدہ عقائد کی تشکیل کرنے لگا یہ واضح ہے کہ آگہی کے عمل کا کافی بڑا حصہ اپنی نوعیت میں عقلی تھا۔ اس کا جرہب محض خالصتاً وجدانی نہیں تھا۔ یہ چشم بینا تھا جسے شعور کی اعلیٰ ترین حالت کے بل پر عام تجربہ کے میدان میں لاگو کیا گیا۔

بلا شبہ نروان کی منزل بدھ مت کی منزل مقصود ہے...... آٹھ نکاتی راستہ اس منزل تک پہنچاتا ہے۔ اس ک ذریعہ ہم بدھ کی تعلیمات کے ایک اور پہلو سے متعارف ہوتے ہیں۔ وہ مخصوص سوالوں کے نا قابل جواب ہونے کی وجہ سے ان کی مذمت کرتا ہے۔ جو غیر متعین۔ سوالات ہیں۔ اور معبود سازی میں مددگار نہیں۔ یہ سوالات دنیا' روح' زندگی و موت کی فطرت پر ہیں۔ جو کہ عارفانہ رو بہت زیادہ گڑبڑ ادینے والے ہیں۔

چنانچہ بدھ مت بنیادی طور پر تلاش مطلق نتائجیت (Pragmatism) لیے ہونے کے باوجود ہماری تجربی شخصیتوں اور مظہری کائنات میں ان کے تجربات کی نسبتی اقدار کے فروغ میں بڑا حصہ رکھتا ہے۔ بدھ کو ماورایت پسند بھی کہتے ہیں۔ اس تعبیر کی جانب میلان رکھنے والے پیروکاروں نے بدھ کی خاموشی میں سے ماورائیت اور تصور کا ایک فلسفہ تشکیل دیا۔

عیسائی مذہبی تجربہ

عیسائی تصوف بیش بہا روحانی سند ہے۔ یونانی فلسفی افلاطون کو عیسائی تصوف کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا سارے کا سارا فلسفہ روحانی اور مابعد الطبیعیاتی ہے۔

افلاطون اور پلوٹینس

عیسائی تصف عیسیٰ مسیح تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ عیسائیت کے مذہب اور فلسفہ کا احاطہ کرتاہ۔ دنیائے روح کے بارے میں یہ افلاطون کا شدید احساس ہی تھا جس نے اسے زمین پر اس قسم کی ریاست بنانے کی طرف راغب کیا جس میں روح کی زندگی ممکن ہو جس بنیادی مسئلے کے ساتھ افلاطون نے اپنا خصوصی تعلق بنایا وہ ثنائی تھا' یعنی مظاہر کے مقابلہ میں حقیق کی نوعیت کیا تھی۔ اور ہم کیسے جان سکتے تھے؟

افلاطون کا نظریہ اعیان یا صورت قطعی عارفانہ ہے۔ اس کے مطابق اعیان کی دنیا حقیقی دنیا ہے۔ اعیان کی ابدی دنیا حقیقی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ہمیں بلند درجے تک جانا چاہیے۔ چنانچہ افلاطون کے خیال میں روح انسان کا اہم ترین حصہ ہے۔ خود افلاطون کی ''خالص فلاطونیت'' وہ تنا تھی جس میں سے پلوٹینس کی نوفلاطونیت کی شاخیں پھوٹیں۔ بعد کا عیسائی تصوف زیادہ تر اسی پر منحصر ہے۔

افلاطون اور پلوٹینس نے دنیا کی علت ایک تثلیث کو بتایا ہے۔ جو مندرجہ ذیل پر مشتمل ہے:

۱۔ واحد

تمام امتیازات سے بالاتر حقیقت مطلق آپ ایک ہستی نہیں بلکہ اس ہستی کا ماخذ ہیں جو اس کی اولین اولاد ہے۔ ''واحد'' کامل یعنی اس کے پاس کچھ نہیں وہ کسی چیز کا بھی متمنی نہیں۔ اسے کسی شے کی ضرورت نہیں لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ چھلکتا ہے اور یہ چھلکنا تخلیقی ہے''۔

۲۔ ناؤس یا فراست

الوہی ذہن کی روح واحد کی تجسیم کے طور پر ایک حقیقی لفظ تمام الوہی تصورات اور علتوں کے لیے منبع یا ہستی جو معقول دنیا کو فیض دیتا ہے ناؤس میں سے مطلق حقیقت اور محدود دنیا کا متوسل پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ نفس

ہماری طبعی کائنات میں گزاری وئی دشوار اور علتی زندگی اور اس کے حیات بخش اصول تمام موجودات کی علت اور سہارا ہیں

اسی مطابقت میں انسان تہری فطرت کا حامل ہے جیساہ سینٹ پال نے بیان کیا ہے: جسم، نفس اور روح ...... Soma Soul and Spirit صوفیانہ راہ کے تین درجے انہی کے مطابقت میں ہیں۔ جسم اور اس کی اشتہاؤں کی پاکیزگی نفس کی بصیرت اور حاصل کردہ مراقبہ جب انسان وہ روحانی پر پیدا کر لیتا ہے جو اسے ناؤس یا فراست کے ساتھ رابطہ کرنے کے قابل بناتے ہیں۔

سینٹ جان اور سینٹ پال

سینٹ جان اور سینٹ پال کے تصوف کو مسیحی تصوف کی اصطلاح میں بیان اور الوہی تصوف سے متمیز کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ متضاد نہیں۔ سینٹ جان اور سینٹ پال کے خیال میں مسیح زندگی اور زندگی دینے والا دونوں ہے ظاہر اور

ظاہر کرنے والا بھی، راہ بھی اور راہنما بھی۔

سینٹ جان کے چوتھے مکاشفہ کا مذہب کا صوفیانہ پہلو خیال کیا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ آغاز میں لفظ تھا اور لفظ خدا کے ساتھ تھا اور لفظ ہی خدا تھا۔ وہ شروع میں خدا کے ساتھ تھا تمام چیزیں اس میں سے جنم لیتی تھیں، اور اسے بغیر کوئی بھی شے ہست میں نہ آتی تھی۔ زندگی اس کے اندر تھی اور زندگی انسانوں کی روشنی تھی۔ روشنی تاریکی میں چمکتی ہے اور تاریکی اس پر غالب نہیں۔ ہر انسان کو پرنور کرنے والی روشنی دنیا میں آ رہی تھی۔ خدا دنیا کے اندر تھا۔ اور دنیا اس سے بنی تھی تاہم دنیا اسے نہیں جانتی جان کے خیال میں دنیا بیک وقت تخلیق کی نمائندہ اور اس کی تیاری بھی ہے۔ جو کچھ بھی وجود میں آیا وہ اس کے اندر زندگی تھا۔ اسی خدا کے توسط سے تمام چیزیں بنیں۔

سینٹ جان قطعی طور پر وعدہ کرتا ہے کہ تمام مسیحی خدا کے ساتھ اندرونی رابطہ قائم کریں گے۔ وہ تمہیں تمام چیزیں سکھائے گا اور تمہارے ذہن میں تمام چیزیں لائے گا۔

سینٹ پال نے رہبانیت اور تصوف کی بنیادوں میں بھی اہم حصہ ڈالا۔ اس کا سارا پیغام یہ فہمائش ہے کہ بپتسمہ کے موقع پر مسیح کے ساتھ قائم ہونے والے قریبی اتحاد کی حقیقت میں زندگی گزاری جائے۔ سینٹ پال کو ایک عارفانہ نظر حاصل تھی اور اس کے ذریعہ اس نے خدا کی مخفی دانائی پر بات کی۔ یہ عارفانہ نظر خدا نے اسے تخلیق کائنات سے قبل ودیعت کی تھی۔ بائبل میں مسیح کی سریت کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ کوئی بھی شخص مسیح میں سما کر نئی مخلوق بن جاتا ہے۔ تمام چیزیں خدا کی ہیں جس نے عیسیٰ مسیح کے ذریعہ ہمیں اپنے مطابق بنایا ہے۔

مسیح کے ساتھ اتحاد مسیح کے ہمارے اندر قیام پر پال نے اصرار نے لوگوں کو اس کے مسیحی تصوف پر بات کرنے کے لیے مائل کیا۔ سینٹ پال کا بنیادی عقیدہ ہے کہ مسیح ہمارے اندر موجود نہیں۔ اور یہ سکونت پذیر روح مصلوب مسیح کے ساتھ اسکے ذہن میں

مقید ہے یعنی اس انسان کے ساتھ جو صلیب پر فوت ہوا۔

مسیحی تصوف اور الوہی تصوف کے علاوہ فطری تصوف اور نفسی تصوف بھی موجود ہے فطری تصوف فطری روح یا خدائے واحد کے نفوذ کلی کے احساس پر مشتمل ہے۔

خالص نفسی تصوف میں خدا کی موجودگی کا تصور کسی بھی قابل بیان صورت میں موجود نہیں۔ روح یا نفس کو بذات خود مقدس اور مخفی خیال کیا جاتا ہے۔ غیر مخلوق روح یا نفسی فطرت یا خدا کے ساتھ صحبت پذیر ہونے کے لیے نہیں بلکہ ایسی حالت میں داخل ہونے کی جدوجہد کرتی ہے جہاں خود اس کے علاوہ کسی بھی چیز سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

اسلامی مذہبی تجربہ

اسلام ہمہ گیر الہام کی تعلیم دیتا ہے اور تمام مذاہب کو خدا کی جانب سے القائی اور مخصوص ضروریات پوری کرنے والے خیال کرتا ہے۔

قرآن کی بہت سی صورتوں میں خدا کی واحدانیت پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔

"اور اگر تمہارا معبود واحد معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(وہ) بے حد رحم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔"

(سیقول۔ آیت ۱۶۴)

یہ تصور تصوف کا ایک بنیادی نظریہ ہے۔ یعنی انیا الوہی شعور میں شامل ہے۔ "وہ اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے"۔ (سورہ الحدید آیت ۴)۔

سر سید احمد تعریفی الفاظ میں مسلمانوں کا سیدھا سادا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ وہ اپنے واحد متبرک جوہر میں موجود ہے۔ وہ تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ تمام اشیاء اپنے وجود کے لیے اسی پر منحصر ہیں۔ وہ کسی پر منحصر نہیں"۔

اللہ ارض السموات کا واحد خالق ہے۔ وقادر مطلق خدا ہے۔ قرآن کی ہر سورہ

ماسوائے نویں سورہ التوبہ کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔ انسان کا دل اللہ کی قربان گاہ ہے۔ اور ہر مسلمان مومن ہے۔ خدا کی واقعیت میں سچے اہل ایمان کیلیے تمام مقدس ہیں کیونکہ اللہ مشرق و مغرب میں محیط ہے لہٰذا تم اپنا چہرہ کیس بھی سمت میں کرو وہاں اللہ کا چہرہ موجود ہے۔

ایک فارسی صوفی لکھتا ہے کہ میں نے اس کائنات کو الوہی اسرار کا دفینہ پایا۔ مرکبات اور اتفاقات عناصر، اجسام، قوتیں اور خواص ان اسرار کے پردے ہی۔

مختلف صوفیانہ مکاتب نے عارفانہ دینیات کے متعدد کم و بیش مختلف نظریات تشکیل دیے ہیں۔ انہیں سات نکات میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ الوہی جوہر قطعی خالص اور خصوصیات سے مبرا ہے۔

۲۔ خدائی روحانی حقیقت کائنات کا الحق، مطلق وجود اور سچائی خوبصورتی اور محبت کا جوہر ہر جگہ موجود ہے اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔

۳۔ تمام اختلاف اور تکثیریت مطلق حقیقت اور قدرے عاری ہے۔

۴۔ تخلیق کا ایک مقصد ہے۔

۵۔ خدا کا مستعد پہلو کائناتی روح ساری کائنات میں جان ڈالتی ہے یہ روح اور زندگی کے ہر قاعدے میں موجود ہے۔ جو خدا کے اور خدا کی جانب سے ہیں۔

۶۔ سچے علم، خوبصورتی اور نیکی کا واحد جوہر ہی حقیقی ہے۔

۷۔ انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد وصال الٰہی ہے۔

تصوف اسلام میں باطنیت کا ایک عنصر ہے۔ صوفی خدا کا دوست اور محبوب کی طرح پیار کرتے ہیں۔ خدا حس یا عقل کے ذریعہ سے نہیں لیکن براہ راست مذہبی تجربہ سے جانا جا سکتا ہے۔ یہ براہ راست مذہبی تجربہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو سب سے پہلے اپنی خودغرض ادنیٰ ذات کو مسخر کرنا لازمی ہے۔ پاکیزگی بھگتی اور خدا کو ماننا حصول خدا کے تین مرکزی مراحل ہیں۔

تصوف کا دارومدار ''بصیرت یا وجدان'' پر ہے۔ وجدان کی جستجو تین قسم کی ہے: (۱) خدا کی جانب سے حاصل کردہ علم' جو خدا کے منکشف کردہ ضابطے پر مشتمل ہے۔ (۲) خدا کی مدد سے حاصل کردہ علم جو باطنی عقیدے کا ہے اور (۳) خدا کا علم' جس کے حامل پیغمبر اولیاء اور اساتذہ تھے جن کا خدا کے ساتھ براہ راست رابطہ تھا اور وہ خدا کی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حصہ دوم

(مذاہب عالم)

اسلام

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مذہب اسلام کے بانی اور خاتم النبیین حضرت محمدؐ ۵۷۰ عیسی میں مکہ میں پیدا ہوئے ۔عربی زبان کا لفظ محمد حمد سے مشتق ہے ۔عہد جوانی میں آپؐ نے بکریاں چرانے کا پیشہ اپنایا اور خوبصورت نخلستانوں میں آپؐ نے کئی مرتبہ اپنے اردگرد الوہی قوت محسوس کی ۔ آپؐ پر اکثر وجد کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی ۔

حضرت محمدؐ کا دل دیدار الٰہی کا متمنی تھا اور آپؐ نے خدا کا حقیقی مذہب جاننا چاہا۔ چنانچہ آپؐ خاموش وادیوں اور غار حرا میں چلے جاتے جو مکہ مکرمہ کے شمال میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے ۔وہاں آپؐ غار میں کئی کئی دن اکیلے یا پھر حضرت خدیجہؓ کے ساتھ رہتے ۔آپؐ نے اعلیٰ ترین صداقت کی روحانی روشنی تلاش میں کئی سال گزارے چالیس برس کی عمر میں آپؐ کو خدا نے فیض یاب کیا اور آپؐ کو لوگوں کا نبی ہونے کی بشارت دی گئی ۔اس موقع پر آنحضورؐ وہ آیات دہرانے لگے جو الہام کے دوران آپؐ پر نازل ہوئی تھیں ۔یہ آیات بعد ازاں قرآن پاک میں بھی شامل ہوئیں ۔اللہ کی جانب سے حکم ملنے کے بعد آپؐ نے لوگوں کو سچے مذہب کی جانب مائل کرنا شروع کیا۔لیکن شروع شروع میں مکہ کے لوگوں نے آپؐ پر زیادہ توجہ نہ دی اور آپؐ کی شان میں گستاخی کے بھی مرتکب ہوئے ۔لیکن خدا کی وحدانیت پر آپؐ کا یقین دریا کی طرح تمام حدیں توڑ کر بہہ نکلا اور آس پاس کے ریگستان کو سیراب کرنے لگا۔۴۴ برس کی عمر میں آپؐ کو اپنی نبوت کا یقین ہو گیا اور آپؐ کے ذہن سے تمام شکوک وشبہات مٹ گئے ۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپؐ کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی ۔۶۳ سال کی عمر میں

سنہ ۶۳۲ء میں آپ کا وصال ہوا۔

حضرت محمدؐ کو کامل یقین تھا کہ خدا دو تین یا زیادہ نہیں بلکہ صرف اور صرف ایک ہے۔ یہ عظیم ترین سچائی پہلے کلمے میں مجسم ہے.....لا الہ الا اللہ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اللہ دنیا کو بنانے قائم رکھنے اور تباہ کرنے والا ہے۔وہ قادر مطلق علم وخبیر اور مطلق ہے۔اللہ تعالیٰ ازازل تا ابد موجود ہے۔وہ نا قابل تغیر رحیم اور شفیق ہے۔دنیا کی واحد علت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ طبعی ہونے کے ساتھ ساتھ ماورا بھی ہے۔

رسول اللہؐ نے صنم پرستی کو غلط قرار دیا اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تبلیغ کی۔آپؐ نے صرف اور صرف وحدہ لاشریک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا۔آپؐ نے اہل ایمان کو تلقین کی کہ اللہ کی عبادت کرو خیرات دو اور بیماری یا سفر میں نہ ہونے پر روزہ رکھو۔ آپ نے کہا کہ سچ بولو لوگوں کی امانتیں انہیں بحفاظت اور پوری کی پوری لوٹاؤ پڑوسیوں کے ساتھ لین دین میں محبت کا مظاہرہ کرو آپؐ نے دھوکہ بازی بدقماشی اور خونیں جھگڑوں سے بچنے کی تعلیم دی۔آپؐ نے مسلمان برادری سے کہا کہ یتیموں کو ان کی جائیداد سے محروم نہ رکھو اور عورتوں کے ساتھ بدکاری مت کرو۔

دریں اثناء الہام کا سلسلہ جاری رہا اور جبرائیل علیہ السلام نے ظاہر ہو کر آپ کو عقیدہ اسلام کے حوالے سے خدائی احکامات پہنچائے مثلاً جنت اور دوزخ' اہل ایمان کے لیے جنت کے لطف و کرم' ایمان نہ لانے والوں کے لیے دائمی دوزخ' روز قیامت وغیرہ۔

اسلام کا مطلب روح کو خدا کے حضور سربسجود کرنا ہے۔رسول اللہؐ نے خدائے واحد کی بادشاہت اور وحدانیت کی تبلیغ کی۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ارض وسما کا خالق ہے۔وہ مطلق ابدی لاحد ود خدا ہے۔اللہ حیات' علم' قدرت ارادہ' سماع بصر اور کلام کا سرچشمہ ہے۔بطور حیات وہ دنیا کی ہر زندہ شے کا ماخذ ہے۔ارادہ سماع بصر اور کلام کا سرچشمہ ہے۔بطور حیات وہ دنیا کی ہر زندہ شے کا ماخذ ہے۔بطور علم وہ ہر چیز سے آگاہ

ہے۔بطور قدرت وہ دنیا کی ہر چیز کا خالق ہے۔ (بشمول ارض وسماء) بطور ارادہ میں دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی ہر بات کا تعین کرتا ہے۔بطور سماع وہ کان نہ ہونے کے باوجود سب کچھ سنتا ہے۔بطور کلام وہ زبان نہ ہونے کے باوجود بات کرتا ہے۔وہ متعدد دیگر خصوصیات بھی رکھتا ہے۔

دین اسلام کے پانچ ستون

سماجی اخلاقی فرائض کی انجام دہی کے لیے اہل ایمان سے پانچ مذہبی اقدامات کی توقع کی جاتی ہے انہیں اسلام کے پانچ ستونوں کہا جاتا ہے ۔ جو مندرجہ ذیل ہیں: (۱) عقیدہ (۲) نماز (۳) زکوۃ (۴) روزہ اور (۵) حج۔

عقیدہ

یہ خدا کی وحدانیت پر مکمل ور غیر متزلزل یقین ہے۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔اس کے علاوہ ہر مسلمان کو ایمان کی مندرجہ ذیل جزئیات پر یقین رکھنا بھی ضروری ہے۔(۱) خدا پر ایمان (۲) ملائکہ پر ایمان (۳) قرآن پاک پر ایمان (۴) انبیاء پر ایمان (۵) قیامت پر ایمان (۶) خدا کے قادر مطلق ہونے پر ایمان اور (۷) رسول اللہ کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان۔

نماز

قرآن پاک میں نماز کو بہت زیادہ اہمیت دی گی ہے۔نماز کا مقصد درخواست کرنا نہیں بلکہ اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرنا ہے۔نماز مسلمان کی مذہبی زندگی اکا محور ہے۔دن میں پانچ وقت نماز ادا کرنا مسلمانوں کے لیے ہمہ گیر قانون ہے۔طلوع آفتاب' عروج آفتاب' سہ پہر' غروب آفتاب' اور تاریکی ہو جانے کے بعد بالترتیب فجر' ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نماز قبلہ رو ہو کر پڑھی جاتی ہے۔جب ممکن ہو عبادت کر لینی چاہیے لیکن نماز باجماعت کی صورت میں مسجد میں پڑھنا قابل ترجیح ہے۔ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے کاروبار بند کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

زکوۃ

زکوۃ ایک قسم کا مذہبی محصول ہے۔ یہ غرباء کے لیے بخوشی اور مرضی سے دیا جانے والا تحفہ ہے۔ قرآن پاک میں غرباء اور متحاجوں کی مدد سے پیسے دینے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد سماجی حیثیت کے اعتبار سے ہر فرد کو برابری کی سطح پر لانا ہے۔ زکوۃ غریب اور امیر کے درمیان فرق گھٹانے میں مدد دیتی ہے۔ اسلام میں خیرات کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے اچھا ہے' اوپر والا ہاتھ دینے والا ہے اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والا۔

روزہ

مذہبی وظیفہ کی چوتھی بنیادی شرط روزہ رکھنا ہے۔ روزے کو مذہب کا دروازہ قرار دیا ہے۔ روزہ تین قسم کا ہے (۱) پیٹ جسم کے دیگر حصوں کو اشتہا اور شدید خواہش کی تسکین کرنے سے روکنا (۲) آنکھوں کانوں زبان ہاتھوں پاؤں اور جسم کے دیگر حصوں کو گناہ سے روکنا (۳) دل کو دنیاوی حرص اور سوچوں کو خدا کے علاوہ تمام چیزوں سے پاک رکھنا۔ سارے ماہ رمضان میں روزے رکھے جاتے ہیں۔ اور ماہ کے آخر میں عید الفطر منائی جاتی ہے۔

حج

بیت اللہ کی زیارت کرنا مسلمانوں کے مذہبی وظائف کا پانچواں بنیادی عنصر ہے۔ ذوالحجہ کے مہینے میں دنیا بھر سے ہزاروں حجاج کرام خانہ کعبہ کے گرد اکٹھے ہوتے ہیں۔ حج عید الفطر سے دس ہفتے بعد ہوتا ہے۔ حجاج کرام روزہ رسول پر بھی حاضری دیتے ہیں۔ ہر صاحب استطاعت اور تندرست مسلمان کے لیے زندگی میں ایک مرتبہ حج کا فریضہ ادا کرنا ضروری ہے۔ حج دنیا بھر کے مسلمان میں جذبہ اتحاد کو بھی فروغ دیتا ہے۔ مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات میں تمام دنیاوی امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔

فلسفہ اسلام

اسلام کی حیثیت محض ایک مذہب کی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ یہ انداز حیات اور ضابطہ حیات بھی ہے یہ کچھ اخلاقی اصول اور سماجی ثقافتی فلسفہ بھی پیش کرتا ہے ارسطو اور نو فلاطونیت سے متاثر الکندی' الفارابی' ابن سینا اور ابن رشد نے کائنات اور خدا کی قدرت کے بارے میں استدلالی تشریحات پیش کیں۔ صوفی الغزالی نے کچھ احادیث اور صوفیانہ تجربے کی تعبیر تصوف کے حوالے سے کی۔ تصوف اور استغراقی تصورات آٹھویں صدی عیسوی میں ہی اسلام کے اندر ترقی پا چکے تھے۔ لفظ صوفی صوف یعنی کھردرے کھدر سے مشتق ہے۔ اور صوفی ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو دنیاوی حرص و ہوا اور آسائشات سے دامن بچا کر سادگی اور پرہیز گاری کی زندگی خدا کی یاد میں بسر کرے۔

الغزالی نے اپنی تحقیقات میں تین صورتوں میں جاری رکھیں۔ پہلی صورت میں اس نے ایک محض نظری اور متکلمانہ دینیات کو نامنظور کرنا چاہا۔ دوسری صورت میں اس نے ایسے یونانی فلسفیانہ تصورات کو رد کرنے کی خواہش کی جو قرآن مجید کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ تیسرے وہ تصوف کے حد سے بڑھے ہوئے دعووں کی کوئی حد بندی چاہتا تھا۔ اسکے خیال میں دنیا خدا میں سے ظاہر نہیں ہوئی بلکہ خدا کی تجسیم ہے جو ہر چیز سے نفوذ پذیر ہے۔

اسلام کی اخلاقیات

اسلام کے اخلاقی اصول پر مسلمانوں کے طرز عمل' برتاؤ اور مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ بہت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ غلاموں کے ساتھ انسانی سلوک روا رکھا جائے۔ مسلمان ہو جانے والے غلام کو آزاد کر دینے والے آقا کو اچھا خیال کیا جاتا تھا۔ قرآن کی دیگر تین ہدایات قابل ذکر ہیں یعنی جوا بازی شراب اور سور کے گوشت سے پرہیز۔ قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ جوا بازی اور شراب نوشی گناہ

ہے جبکہ سور کا گوشت پلید ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ برادرانہ اور رفیاضانہ سلوک کرنا چاہیے۔ مذہب اسلام کی خدمت کو بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔انسانیت کی بھلائی اور انسانوں کی خدمت کا مطلب خدا کی اطاعت شعاری کرنا ہے۔اسلام امن اور سلامتی' طمانیت اور رضائے خدا تسلیم کرنے کا مذہب ہے۔مسلمان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نرم دل مخلص حق پرست مخیر اور گناہ سے دامن بچانے والا بنے۔

مذہبی صحائف

دین اسلام کے مطابق قرآن پاک قیامت تک پوری کائنات کے لیے نور و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔قرآن کی حاکمیت اعلیٰ غیر متزلزل ہے۔قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ قرآن پاک کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کے ذریعہ انسانوں کو مخاطب کیا۔ رسول اللہؐ نے ہی قرآن پاک کی آیات لوگوں تک پہنچائیں۔قرآن پاک میں ۳۰ پارے اور ۶۶۶۶ آیات ہیں۔ مذاہب عالم کی عظیم کتب کے درمیان قرآن پاک کی حیثیت عظیم تر ہے۔ یہ دنیا کی غالباً واحد ایسی کتاب ہے جو ہزاروں مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ خدا نے قرآن پاک کی حفاظت خود کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ۔مسلمان اس کتاب کی شان میں ذرہ برابر گستاخی بھی برداشت نہیں کرتے' اور تمام مذہبی تہواروں اور اہم موقعوں پر برکت کے لیے قرآن پاک کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔

مسلمان فرقے

عقیدے' مذہب اور خدا پر ایک جیسا مضبوط یقین ہونے کے باوجود مسلمان بہت سے فرقوں میں تقسیم ہیں۔حضرت محمدؐ نے خود پیش گوئی کی تھی کہ امت مسلمہ ۷۲ فرقوں میں بٹ جائے گی۔

دو مرکزی فرقے اہل تشیع اور اہل سنت ہیں۔اہل سنت مسلمان پہلے تین خلفائے

راشدین حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کی روحانی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ جبکہ اہل تشیع حضرات کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ رسول اللہؐ کے بعد اسلام کے روحانی رہنما ہیں۔ اہل سنت مسلمان اکثریت میں ہیں اور ان کا مسلک سنت کی بنیاد پر ہے۔ بایں ہمہ بہت سے خطوں میں شیعہ فرقہ بھی غالب ہے ایران' عراق اور اہل تشیع کا غلبہ ہے۔ جبکہ زیادہ تر مسلم دنیا میں اہل سنت فرقہ والوں کی اکثریت ہے۔

نتیجہ بحث

اسلام مسلمانوں کو اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے پر زور دیتا ہے۔ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' سارے مذہب کی بنیاد ہے۔ مسلمان کہلانے کے لیے سب سے پہلے خدا کی وحدانیت' رسول اللہؐ کے آخری نبی ہونے اور قرآن شریف کے آخری کتاب ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے۔ نماز' روزہ' حج اور زکوۃ بھی دین اسلام کے ستون ہیں جن کے بغیر ایمان کی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔

قرآن پاک کو دنیا بھر کی مذہبی کتب میں ایک ممتاز اور بے مثال مقام حاصل ہے۔ آیات کا ترنم اور پاکیزگی سننے والے کی سماعت اور دل دونوں پر اثر کرتی ہے۔ یہ رشد و ہدایت اور ابدی دانائی کی کتاب ہے۔ قرآن پاک میں قادر مطلق کی یکتائی اور وحدانیت پر بہت زور دیا گیا ہے جو دین اسلام کی اساس ہے۔ قرآن پاک کے مطابق راست بازرویہ پرہیز گاری حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کرنا ہی حقیقی اسلام ہے۔ قرآن پاک کا ایک اہم ترین پیغام یہ بھی ہے کہ ساری انسانیت اور ساری تخلیق ایک برادری کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

۱۲ :: عیسائیت

"میں راہ ہوں...... ہاں اور سچائی اور زندگی۔ میرے وسیلے کے
بغیر کوئی بھی باپ تک رسائی نہیں پا سکتا"۔ (عیسیٰ مسیح)

عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ مسیح کو افلاکی باپ کی تجسیم اور انسانیت کا نجات دہندہ مانتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ تقریباً دو ہزار سال پہلے بیت اللحم میں کنواری ماں کے بطن سے ۲۵ دسمبر کو پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے فاضل یہودیوں کے مشکل ترین دینیاتی سوالات کا جواب دے کر الوہی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ یروشلم میں عظیم میلے کے موقع پر انہوں نے لاتعداد بے گناہ میمنوں کی قربانی اور ان کا خون خدا کی نذر ہوتے دیکھا۔ حضرت عیسیٰ نے یہودی مذہب کی تشکیل نو کرنا ضروری سمجھا۔

بپتسمہ کے موقع پر غیب سے ایک آواز سنائی دی "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس پر میں بہت خوش ہوں"۔ تقریباً تیس سال کی عمر میں عیسیٰ عوام کے سامنے نمودار ہوئے اور غریبوں کو تعلیم دی' بیماروں کو شفا دی اور برائیوں کو دور کیا' اندھوں کو بصارت اور بہروں کی سماعت بحال کی' مردوں میں جان ڈالی' پانی پر قدم رکھے اور بہت سے معجزے دکھائے۔ کینہ پرور پیروکاروں نے حضرت عیسیٰ پر ملحدیت کا الزام لگایا اور انہیں گاؤں کے گورنر کے سامنے مقدمہ کے لیے لایا گیا۔ گورنر نے سزائے موت سنائی اور انہیں مصلوب کر دیا گیا۔ موت کے بعد ان کی تعلیمات اور وعظ دنیا بھر میں پھیل گئے۔ معتقدین نے انہیں عیسیٰ مسیح اور خود کو عیسائی یا مسیحی کہا۔

عیسیٰ مسیح کی تعلیمات

حضرت عیسیٰ مسیح دنیا کے عظیم استاد تھے۔ انہیں بچپن سے ہی خدائی بصیرت حاصل تھی۔ وہ پاکیزگی اور سچائی کی تجسیم تھے۔ ترک دنیا' نفس کشی اور ایثار کے ذریعہ

انہوں نے تمام قوموں کے روحانیت پرست لوگوں کے دل فتح کیے اور انہیں برکت کی زندگی گزارنے' دوسروں کے کام کرنے اور انسانیت کی خاطر جان نثار کرنے کی تعلیم دی۔

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں خیرات' نفس کشی' ترک دنیا' تزکیہ نفس ہمہ گیر محبت اور خدا پر یقین کا بیج بویا گیا۔ مسیح کے لیے خدا کو ''باپ'' کہہ کر پکارنا بالکل فطری اور گرانقدر تھا۔ ان کے اور دنیا کی باقی تمام مخلوقات کے لیے خدا باپ تھا۔ ''میں اور میرا باپ ایک ہی ہیں''۔

عیسیٰ مسیح نے کوہ سینائی پر اپنی کچھ قابل قدر تعلیمات پیش کیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

''تمہارا دل نہ گھبرائے۔ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو مجھ پر بھی ایمان رکھو۔ میرے باپ کے گھر میں بہت سے مکان ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو میں تم سے کہہ دیتا ہوں' کیونکہ میں جاتا ہوں تا کہ تمہارے لیے جگہ تیار کروں۔ اور اگر میں جا کر تمہارے لیے جگہ تیار کروں تو پھر آ کر تمہیں اپنے ساتھ لوں گا تا کہ جہاں میں ہوں تم بھی ہو''۔ (یوحنا' ۱۴ باب: ۱تا ۳)

''......میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر ایمان رکھو اور شک نہ کرو تو بہت کچھ کر لو گے...... بلکہ اگر پہاڑ سے بھی کہو گے تو اکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ تو یوں ہی ہو جائے گا۔ اور جو کچھ دعا میں ایمان کے ساتھ مانگو گے وہ سب تم کو مل جائے گا'' (متی ۲۱ باب' ۲۱' ۲۲)۔

''......اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا زندگی خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے

ہیں۔ پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے...... اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے' کیونکہ تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو...... پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے دن کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے" (متی' ۶ب: ۲۴ تا ۳۴)۔

حضرت عیسیٰؑ کے وعظ

۱۔ مبارک ہیں وہ جو غریب ہیں' کیونکہ ان کے لیے آسمان کی بادشاہت ہے۔

۲۔ مبارک ہے وہ جو دکھ سہتے ہیں' کیونکہ انہیں راحت ملے گی۔

۳۔ مبارک ہیں وہ جو کمزور ہیں' کیونکہ وہ زمین کی میراث پائیں گے۔

۴۔ مبارک ہیں وہ جو سچائی کے لیے بھوکے اور پیاسے ہیں' کیونکہ ان کو تسکین ملے گی۔

۵۔ مبارک ہیں وہ جو دردمند ہیں' کیونکہ انہیں رحم حاصل ہوگا۔

۶۔ مبارک ہیں وہ جن کا دل پاکیزہ ہے' کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔

۷۔ مبارک ہیں وہ جو امن پسند ہیں' کیونکہ انہیں خدا کے بیٹے کہا جائے گا۔

۸۔ مبارک ہیں وہ جو سچائی کی خاطر مصلوب کیے جاتے ہیں' کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان کی ہے۔

۹۔ مبارک ہو تم جب آدمی تم پر میرے حوالے سے ظلم کرتے اور ہر قسم کی بری بات کہتے ہیں۔

۱۰۔ خوش اور مسرور ہو کیونکہ آسمان میں تمہارا انعام بہت عظیم ہے' کیونکہ آدمیوں نے تم سے پہلے آنے والے نبیوں کو بھی قتل کیا۔

عیسائیت کا فلسفہ

عیسیٰ مسیح اور خدا

عیسیٰ مسیح نے زور دیا ہے کہ خدا شخصی ہے۔ عہد نامہ عتیق میں خدا شخصی حوالے سے بات کرتا ہے۔ مسیح نے کہا ابتدا میں مسیح تھا اور مسیح خدا کے ساتھ تھا اور مسیح (کلام) خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔ اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھی۔ اور نور تاریکی میں چمکتا ہے اور تاریکی نے اسے قبول نہ کیا۔" (یوحنا' اب: ا تا ۵)

خدا ایک ہے۔ وہ اولین محرک یا بے علت علت ہے۔ خدا نے عدم میں سے دنیا تخلیق کی۔ خدا نے اپنے ارادے سے دنیا بنائی۔ دنیا کی تخلیق زمان و مکاں میں' بلکہ خدا نے زمان و مکاں کی تخلیق دنیا میں ایک حصے کے طور پر کی۔ تخلیق شدہ دنیا اچھی ہے۔ خدا اچھا شفیق اور عادل ہے۔ خدا اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ خدا مہربان ہے۔ خدا اگرچہ مطلق اچھائی اور مطلق علم ہے لیکن انسان کو غلط راہ پر چلنے اور نتائج کا دکھ سہنے سے بچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔

مندرجہ بالا تمام خوبیاں کم و بیش خود حضرت عیسیٰ میں پائی جاتی تھیں۔ حضرت عیسیٰ بھ باپ یعنی خدا کے برابر ہیں۔ سینٹ جان کے مطابق حضرت عیسیٰ انجیل میں کہتے ہیں: "باپ مجھ سے عظیم تر ہے" (یوحنا' ۱۴ ب: ۲۸) ایک اور جگہ پر وہ ہمیں کہتے ہیں کہ انہیں باپ سے "ہدایت" ملی ہے اور وہ اپنے طور پر "کچھ نہیں کر سکتے"۔ یوحنا کی انجیل میں تصدیق کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ باپ کے برابر ہیں۔ حضرت عیسیٰ خود بھی باپ کی ہمسری کا دعویٰ مزید واضح طور پر کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں اور باپ ایک ہی ہیں"۔ (یوحنا ۱۰ ب: ۳۰)

خدا بطور باپ ارض وسماء کا خالق ہے۔ خدا بطور بیٹا انسانیت کا نجات دہندہ ہے۔ اور چرچ کی عبادت اور زندگی کا مرکز ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ خدا کی تجسیم تھے۔ لیکن عیسائی انہیں خدائی انسان سمجھتے تھے۔ کیونکہ تجسیم الوہیت سے کچھ بڑھ کر ہے۔ وہ الوہی محبت' الوہی رحمت اور الوہی نیکی کی کامل تجسیم تھے لیکن حضرت عیسیٰ خدا نہیں۔

یہودی عیسائی تصور کے مطابق خدا لامحدود' ابدی' خود موجود' ہر موجود چیز کا خالق اور اپنے آپ سے ماورا ہے۔ خدا کو بطور آقا اور بادشاہ کے ساتھ ساتھ بطور باپ بھی خیال کیا جاتا ہے۔ خدا کی اچھائی محبت اور رحمت ہم معنی ہے اور ان سب مین محبت کی اصطلاح مشترک خصوصیت ہے۔ وہ سوچ اور فعل دونوں میں مقدس ہے۔ چنانچہ عیسائیت میں خدا کو لامحدود ازلی غیر تخلیق شدہ شخصی حقیقت خیال کیا جاتا ہے جس نے اپنے علاوہ تمام ہستیوں کو تخلیق کیا۔ اور جس نے نوع انسانی پر خود کو مقدس اور محبت کرنے والے کے طور پر منکشف کیا۔ حضرت عیسیٰ نے خدا کے ساتھ اپنی یکجائی کی تبلیغ کی اور اپنے بارے میں کہا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں۔

مکاشفہ

مکاشفہ کی تعریف کسی استدلالی مخلوق کے ساتھ خدا کے رابطے کے طور پر کی جاسکتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مکاشفہ کا مافیہ جملوں یا اقوال میں بیان کردہ سچائیوں کا مضمون ہے۔ اس قسم کی مبینہ خود انکشافی کو دینیاتی زبان میں ''مکاشفہ'' (یا الہام) کہتے ہیں۔

عہد نامہ عتیق میں خدا نے خود کو بطور منصف و ہیبت ناک منکشف کیا جبکہ عہد نامہ جدید میں بطور رحیم۔ مذہبی صداقتوں کی الوہی تشہیر کے طور پر مکاشفہ مصدقہ انداز میں بائبل میں تحریر شدہ ہے۔

مکاشفہ کے قصیاتی نظریہ کے ساتھ ہمیشہ قدرتی اور الہامی دینیات کے درمیان امتیاز منسلک رہا ہے۔ قدرتی دینیات سے مراد وہ تمام دینیاتی صداقتیں تھیں جنہیں

انسانی عقل کسی مدد کے بغیر جان سکتی تھی۔ مثلاً یقین کیا جاتا تھا کہ خدا کا وجود اور خصوصیات اور روح کی لافانیت کو کسی کے مکاشفہ کی مدد کے بغیر منطقی دلائل سے ثابت کرنا ممکن ہے۔ دوسری طرف مکاشفاتی یا الہامی دینیات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان مزید صداقتوں پر مشتمل ہے۔ جو انسانی استدلال کے ذریعہ قابل رسائی نہیں اور جنہیں ہم صرف اسی صورت میں جان سکتے ہیں جب خدا خصوصی طور پر ہمارے اوپر ان کا مکاشفہ کرے۔

مکاشفہ پر مذہبی اعتقاد عقائدانہ تفصیلات سے بوجھل ہیں' لیکن اپنے جوہر میں درست ہین۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کا تعلق خدا کو منکشف کرنے والی حقیقت کی نوعیت سے ہے چاہے سننے والے کان اور جواب دینے کی تمنا کچھ بھی ہو اس مفہوم میں مکاشفہ صرف مذہبی تجربہ کے حلقے تک ہی محدود نہیں۔ یہ انسانی علم کی ترقی کی شرط ہے اور درحقیقت کسی بھی میدان میں تمام انسانی کامیابی کی بھی...... چاہے یہ میدان سائنس کا ہو' فن' اخلاقیات مذہب یا پھر روزمرہ زندگی کا۔ لیکن بالخصوص طور پر مذہبی تجربہ وہ نقطہ لگتا ہے جہاں مکاشفہ کی منتشر روشنی مرکوز ہوتی ہے۔ یعنی جہاں حقیقت (خدا) خود کو انسان پر اپنی عمیق اور بھرپور ترین سطح پر منکشف کرتی ہے۔

شفاعت یا نجات

شفاعت کا مطلب نجات دلانے کا عمل ہے۔ عیسائیت میں اس سے مراد یسوع مسیح کی قربانی سے گناہوں اور ان کے عواقب سے نجات پانا ہے۔ عیسیٰ مسیح انسانیت کے محافظ اور شفاعت دہندہ تھے۔ گناہوں سے چھٹکارا پانا گناہگاری کی زندگی ترک کرنے کا عہد کرنا اور محبت خدمت اور بھائی چارے کی زندگی اپنانا نجات کی پہلی شرطہے۔ روحانی شفا دوسرا مرحلہ ہے۔ یہ طبعی بھی ہو سکتی ہے۔ ذہنی بھی۔ نجات میں لازمی طور پر روح کی پاکیزگی شامل ہے۔ نجات خدا کی محبت اور اس محبت پر یقین سے ملتی ہے اور خدا سے محبت کے جواب میں گناہوں کی معافی نہ ماننا ناممکن ہے۔ اس قسم کی نجات کے لیے

خدا کی رحمت اور محبت لازمی ہے۔ یہ عبادت' دعا' مراقبہ اور الوہی محبت کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔

تجسیم نو

تجسیم نو کا مطلب ظاہری موت کے بعد دوبارہ زندگی یا شعور میں واپس لانا ہے۔ حضرت عیسیٰ کو مصلوب اور پھر دفن کیا گیا۔ لیکن صحائف کے مطابق تین دن بعد مسیحؑ کی روح قبر میں سے اٹھی۔ یہی تجسیم نو ہے۔ تب حضرت عیسیٰؑ اپنے کچھ قریبی حواریوں اور ماں حضرت مریم کے سامنے ظاہر ہوئے۔

حضرت عیسیٰ کے ظہور نو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کچھ محققین نے ان بیانات کے مستند ہونے پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ صرف ان کے سامنے ظاہر ہوئے جن کا شمار ان کے قریبی رفقاء اور حواریوں میں ہوتا ہے نہ کہ ساری دنیا کے سامنے۔ یروشلم میں ان کے شاگردوں نے پہلے پہل یہی خیال کیا کہ وہ ایک روح ہیں۔ ان بیانات سے ہم یہ نتیجہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ ظہور نو اپنی فطرت میں غیر واقعی لگتا ہے۔ چند شکوک زدہ شاگردوں کی موجودگی میں مسیحؑ کی طبعی حاضری اور "بھنی ہوئی مچھلی اور شہد" کھانا منطقی اعتبار سے قابل ادراک نہیں۔ آیا یہ محض ایک نفسیاتی وقوعہ تھا۔ یا عقیدے اور حسن شعور کا معاملہ' یا کسی طاقتور روح کی کارگزاری' یا پھر حضرت عیسیٰ جسمانی طور پر دوبارہ ظاہر ہوئے......اس بات کا صرف اس کا تجربہ کرنے والے لوگوں ہی کو علم ہوگا۔

تاہم حضرت عیسیٰ کی وفات نے شاگردوں کو مایوسی اور بدنظمی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ لیکن کچھ لوگ حضرت عیسیٰ کی روحانی نو کو قبول اور جسمانی تجسیم نو کو رد کرتے ہیں۔ شاید حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی روح ان کے پیروکاروں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتی رہی۔

گناہ اور دکھ

گناہ خدائی معیار کے مطابق زندگی گزارنے میں ناکامی کے لیے بائبل لفظ ہے۔ اس میں ''غلطی'' سے لے کر ''مکاری'' تک مختلف معنی شامل ہیں۔ بائبل تعلیم دیتی ہے کہ گناہ اعمال رویوں کی ایک درجہ بند فہرست نہیں بلکہ ایک حالت ہے۔ انسان فطرتاً گناہ گار ہے۔ چنانچہ وہ گناہ گارانہ عمل سرانجام دیتا ہے۔ (یوحنا اب:۸تا۱۰)۔ انسان کی گناہ گار حالت (ایک روحانی بیماری) نے اسے خدا سے جدا کر دیا' کیونکہ خدا پاکیزہ اور منصف ہے اور گناہ کی سزا دیتا ہے۔ تاہم خدا ایک شخصی اور رحیم دیوتا بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی انسان اس کے معیاروں کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتا۔ چنانچہ اس نے انسان (حضرت عیسیٰ مسیح) کا روپ دھارا اور ہمارے لیے وہ زندگی گزاری۔

عیسائی صحائف میں حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا برائی یا گناہ کی تاریخ کا نکتہ عروج ہے تمام تر گناہ دکھ اور برائی شیطان کی مثبت قوت کی وجہ سے ہے۔ لیکن چونکہ خدا اچھا اور محبت کرنے والا ہے۔ اس لیے وہ ہمارے گناہ معاف کرتا ہے اور ہمیں نئی اور ابدی زندگی دیتا ہے۔

عیسائیت کے فرقے

عیسائیت کے اہم فرقوں کی مندرجہ ذیل درجہ بندی کی جاتی ہے۔ رومن کیتھولک' مشرقی ارتھوڈوکسی' پروٹسٹنٹ اور لوتھریت۔

رومن کیتھولک

رومن کیتھولک کلیسا کی بنیاد سینٹ پال نے رکھی۔ یہ دنیا میں عیسائی تنظیموں میں سب سے بڑا ہے۔

روم کیتھولک کلیساء بشپس کے تحت ایک پیچیدہ نظام مراتب رکھتا ہے۔ جس کا سربراہ روم میں پوپ ہے۔ کلیسا کو عموماً ''خدا کے لوگ'' کہا جاتا ہے۔

رومن کیتھولک حضرت عیسیٰ مسیح کے دس فرامین کے علاوہ کلیسا کے فرامین کی اطاعت

بھی کرت ہیں۔ پہلے فرمان میں ہمیں ہدایت کی گئی ہے۔ کہ صرف ایک سچے ارو زندہ خدا کی عبادت یقین' امید خیرات اور مذہب کے ساتھ کریں۔ دوسرا فرمان تقاضا کرتا ہے کہ ہم خدا اور مقدس لوگوں اور چیزوں کے بارے میں تعظیم کے ساتھ بازت کریں اور اپنے قانونی عہد اور حلف پورے کریں۔ تیسرے فرمان کے مطابق اتوار کو چھٹی کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ خدا نے چھ دن میں دنیا تخلیق کر کے ساتویں دن آرام کیا۔ تھا اور ایک اتوار کا دن سبت کا دن ہے۔ چوتھا فرمان ہے ''پڑوسیوں سے ہماری محبت خدا سے ہماری محبت کا ثبوت ہے'' پانچواں فرمان تمام قتل و غارت سے منع کرتا ہے۔ جبکہ چھٹا اور نواں فرمان ہر ایسی بات سے روکتا ہے جو سوچ الفاظ یا عمل میں مقدس پاکیزگی کے برعکس ہے۔ آٹھواں فرمان ہمارے پڑوسی کی نیک نامی کی حفاظت کرتا ہے۔ اور جھوٹی گواہی' دروغ دوئی اور غیر منصفانہ فیصلے سے روکتا ہے۔ ساتواں اور دسواں فرمان تمام حریصانہ خیالات اور پڑوسیوں کی اشیاء' منافعوں کے لیے خواہشات اور دوسروں کی چیزیں بے ایمانی سے لینے کی مخالفت کرتا ہے۔

کیتھولک کلیساء امریکہ' یونان' روم وغیرہ میں وسیع پیانے پر پھیلا ہوا ہے۔

مشرقی آرتھوڈوکسی

مشرقی آرتھوڈوکسی کلیساء کا مرکزی مقام قسطنطنیہ میں واقع ہے۔ چار مشرقی بشپس اور آرک بشپ متشکل کرتے ہیں جو ہم سروں کا مرکز کے طور پر جانی مانی جاتی ہے رومن کلیسا کی طرح مشرقی کلیسا بھی بشپس' پادریوں' راہبوں' راہباؤں اور عوام پر مشتمل ہیں۔ آرتھوڈوکسی تعلیمات کے مطابق ہر کوئی انسان کلیسا کا سربراہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ مسیح نے کلیسا کی ایک سلسلہ مراتب والی پادریانہ تنظیم کے ساتھ قائم کیا تھا جو اس کی نگرانی کر سکے۔ مشرقی کلیسا اپنے ارکان کی زندگی کے صوفیانہ پہلو کے ساتھ منسلک ہے مشرق میں عیسائیوں کی اس بات پر مخالفت کی جاتی ہے کہ وہ نجات کی متلاشی چند افراد کے مجموعہ کے طور پر کلیسا کی تحقیر کرتے ہیں۔

مشرقی آرتھوڈوکسی کلیسا مرکزی طور پر یونان، رومنی بلگاریہ، روس اور مشرق وسطیٰ میں واقع ہے۔

پروٹسٹنٹ ازم

اس کی بنیاد ایک کلیساء کی حیثیت سے نہیں رکھی گئی بلکہ یہ مغربی عیسائیت کے اندر ہی اندر ایک تحریک بن کر ابھرا۔ یہ روایت پرستی، کٹرپت اور رومن یورپ میں تمام اختیارات اور قوتوں کے ارتکاز کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ پروٹسٹنٹ کا لفظ ہی Protest یعنی احتجاج سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد عیسائی ہے جو رومن کیتھولک یا مشرقی آرتھوڈوکسی کلیسائیں سے میں کسی کا مقلد نہ ہو۔ اسے اردو میں احتجاجیوں کا مذہب کہہ سکتے ہیں۔

پروٹسٹنٹ فرقہ تعلیم دیتا ہے متبرک روغن (Sacraments) وصول کرنا، زبور کی تلاوت یا مقدس مقامات کی زیادہ وغیرہ جیسا کوئی بھی مذہبی فریضہ خودبخود نجات نہیں دلا سکتا۔ پروٹسٹنٹ کہتے ہیں کہ خدائی کیفیت انسانی معاملات کے طرز عمل اور زندگی کی اخلاقی پاکیزگی میں آشکار ہوتی ہے۔ وہ پہلے فرمان پر احتجاج کرتے ہیں میں خداوند تیرا غیور خدا ہوں......تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا......نہ ان کی عبادت کرنا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کے علاوہ تمام عیسائی اس فرمان کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ رومن کلیساؤں کی طرح سے حضرت عیسیٰؑ کی عبادت نہیں کرتے۔

آج کل ہر چوتھا عیسائی خود کو پروٹسٹنٹ سمجھتا ہے۔ دنیا کے متعدد ممالک میں پروٹسٹنٹ کلیسا موجود ہیں لیکن انہیں منظم کرنے والی مرکزی تنظیم نہیں ہے۔

لوتھریت

دنیا بھر کے پروٹسٹنٹوں کا تقریباً ایک تہائی حصہ اپنا سلسلہ نسب مارٹن لوتھر اور اس کے قریبی پیروکاروں سے ملاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ اصلاحات نے مارٹن لوتھر کی بغاوت سے پہلے تک سنجیدہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ لوتھر کو یقین تھا کہ اس تحریک کے

ذریعے سے عہد نامہ جدید کا اصلی کلیساء بحال کیا جا سکتا تھا۔

لوتھر کے مطابق انسانوں کے پاس خدا کو جاننے کا صرف ایک ہی نظریہ ہے یعنی الوہی الہام۔اعلیٰ ترین الہام حضرت عیسیٰ میں پایا جاتا ہے۔جو مجسم خدا ہے۔لوتھر بیشتر رومن خیالات کو تسلیم کرتا رہا۔اسے یقین تھا کہ مقدس صحائف عمل کی بجائے صرف عقیدے کے ساتھ نجات کا دعویٰ کرتے ہیں۔اس کا عقیدہ تین Solas میں خلاصہ بند ہے اور انسانی نجات کے لیے صرف صحائف'صرف رحمت یا صرف عقیدے کی ضرورت ہے۔

نتیجہ بحث

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک تہری ہستی ہے۔تین الگ الگ شخصیتوں کی حامل...... باپ' بیٹا اور روح۔ چنانچہ خدا تین بنیادی خصوصیات والی شخصی ہستی بھی ہے......معروف کل'مختار'اور ہر جگہ موجود۔وہ لامحدود اور ابدی ہے۔

حضرت عیسیٰ دنیا کے منظر میں آنے والے کسی بھی اور شخص جیسے نہیں۔وہ ایسے انسان تھے جو مافوق الفطرت حالات کے ذریعہ پیدا ہوئے۔کچھ کا کہنا ہے کہ وہ دنیا کی عظیم ترین زندہ مثال تھے اعلیٰ ترین استعداد کے حامل ایک اخلاقی گرو۔

خدا دنیا کے ہر شخص سے محبت کرتا ہے محبت خدا کا عظیم ترین اظہار ہے۔خدا محبت ہے اور محبت میں زندہ رہنے والی ہر شے خدا کے ساتھ اور خدا ان کے ساتھ رہ رہا ہے۔

خدا حضرت عیسیٰ میں خود بولتا ہے یا سوچتا تھا۔مسیح انسانی وجود میں خدا کی تثلیث ہے......لفظ سوچ اور شعور خدا تمام تما ناموں اور صورتوں سے بالاتر مقدس واحد ہے' جس نے بطور باپ حضرت عیسیٰ کی گہرائیوں میں خود کو قریبی طور پر پیش کیا۔حضرت عیسیٰ 'نادیدہ خدا کی شبیہہ' ہے۔

بائبل میں خدا کا ذہن'انسان کی حالت'راہ نجات' گناہگاروں کا مقدر'یقین رکھنے والوں کی شادمانی شامل ہے۔اس کے عقائد مقدس'تواریخ درست'ہدایات قابل پیروی

اور فیصلے ناقابل تردید ہیں۔ عہد نامہ جدید کے مطابق ابتدا میں صرف مسیح موجود تھا خدا کے ساتھ‘ وہ ہمیشہ سے زندہ اور بذات خود خدا ہے۔ اس نے ہر موجود شے تخلیق کی...... کوئی شے ایسی نہیں جو اس نے نہ بنائی ہو۔ اس کی زندگی ابدی ہے اور یہ زندگی ساری نوع انسانی کو منور کرتی ہے۔ اس کی زندگی تاریکی کو روشن کرنے والا نور ہے...... اور تاریکی اس نور پر کبھی غلط نہیں پا سکتی۔ بعد ازاں‘ اپنے ایک مکالمے میں حضرت عیسیٰ نے کہا کہ لوگو میں دنیا کا نور ہوں۔ اس لیے اگر تم میری پیروی کرو گے تو تاریکی میں لڑکھڑاؤ گے نہیں کیونکہ زندہ نور تمہاری راہ کو روشن کرے گا‘‘۔

☆☆☆

۱۴ :: ہندومت

''میں صرف ہندومت کو کسی دوسرے مذہب پر فوقیت نہیں دیتا بلکہ ایسا مذہب جو ہندومت سے بالاتر ہو کر انسان کی عین فطرت بدل دیتا ہے انسان کو اندر سے صداقت کے ساتھ ناقابل علیحدگی طور پر باندھ دیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے پاکیزہ بناتا ہے''۔ (موہن داس کرم چند گاندھی)

تعارف

شری رام کرشن نے ایک مرتبہ کہا تھا میرا یا تمہارا کوئی مذہب میرا قومی مذہب یا تمہارا قومی مذہب ہرگز موجود نہیں۔ بہت سے مذاہب موجود نہیں ہیں صرف ایک لامحدود مذہب موجود ہے اور یہ مذہب مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے خود کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ ہمیں تمام مذاہب کا احترام کرنا اور ہر ممکن حد تک انہیں قبول کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سوامی ویوکانند نے بھی مذہب کی تعریف انسان کے اندر ہمیشہ سے موجود الوہیت کے اظہار کے طور پر کی ہے۔ مذہب کسی صداقت سے نہیں ڈرتا' کیونکہ صداقت مذہب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہاں پر ''سچا مذہب'' الفاظ کا استعمال اس مفہوم میں نہیں کیا گیا کہ ''میرا مذہب'' سچا ہے اور تمہارا مذہب جھوٹا۔ یہ مذہب کا ای قطعی غلط تصور ہے۔ جیسا کہ شری رام کرشن نے کہا تھا ''ہر مذہب سچا ہے'' کچھ لوگ بڑی ایمانداری کے ساتھ شک کرتے ہیں کہ عیسائیت سچی ہے تو ہندومت بھی سچا کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر ان کا مذہب سچا ہے تو دوسروں کا مذہب ضرور جھوٹا ہوگا کیونکہ وہ ان کے مذہب سے اختلاف رکھتا ہے۔ یہ مذہب کے بارے میں ایک نہایت بچگانہ اراحمقانہ تصور ہے۔ جس طرح اآپ کے وجود کی سچائی میرے وجود کی سچائی کو جھٹلاتی ہے۔ بالکل اسی

طرح آپ کے مذہب کے سچا ہونے کی حقیقت میرے مذہب کی سچائی کی تردید نہیں کرتی۔تاہم تمام مذاہب ایک جیسے نہیں بلکہ تمام مذاہب سچے ہیں۔مثلاً آپ کوہ ہمالیہ کی تصاویر ہندوستان تبت یا چین کی طرف سے لیں گے تو کوئی بھی تصویر دوسری جیسی نہیں ہوگی۔لیکن بلاشبہ وہ تمام تصویریں کوہ ہمالیہ ہی کی ہیں۔

دنیا کے بڑے مذاہب کی موٹی موٹی زمرہ بندی تین حوالوں سے کی گئی ہے یعنی ...... ہندوستانی گروپ ...... ہندومت' بدھ مت' جین مت' اور سکھ مت۔مغربی گروپ...... زرتشت مت' یہودیت' عیسائی اور اسلام] شیرو' جاپانی گروپ...... تاؤ مت' کنفیوشس مت اور شنتومت۔

ہندومت کا تصور

ہندومت ہندوؤں کی قدیم آریہ دھرم ہے۔جب فارسی حملہ آور ہندوستان کے شمال مغرب میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ دریائے سندھو کے کناروں پر آریائی مرتاضوں کی اولادیں رہتی تھیں۔فارسی میں س کی آواز ھ بن جاتی ہے۔اس لیے انہوں نے اسے سندھو دریا کی بجائے ہندو دریا کہا۔بعدازاں سندھو دریا کے کناروں پر آباد یہ لوگ ہندو پہچانے جانے لگے۔اور ان کی سرزمین ہندوستان جبکہ مذہب ہندو مت کہلایا۔

ہندومت کا فلسفہ

خدا: وحدانیت

فلسفیانہ نکتہ نظر سے ہندومت غیر ثنائی ہے۔ اور مذہبی نکتہ نظر سے توحید پرستانہ۔ ہندو فلسفہ' خدا روح اور دنیا کی بنیادی غیر ثنائیت پر زور دیتا ہے۔ ظاہری امتیازات صرف ناموں اور صورتوں کی پیداوار ہیں۔ لیکن چونکہ ہم مطلق حقیقت میں یقین رکھتے ہیں اس لیے یہ تمام ظاہری امتیازات ہماری لاعلمی کی وجہ سے ہیں۔ اگر چہ ہندومت دیوتاؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مانتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ انہیں خدائے واحد کے مختلف روپ خیال کرتا ہے۔ برہما' وشنو' اور شیو کی تثلیث الوہیت کے تین پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو تخلیق کرنے والے قائم رکھنے والے اور برباد کرنے والے کے عمل کو کنٹرول کوتے ہیں...... یعنی برہما پیدا کرنے والا' وشنو قائم رکھنے والا اور شیو مارنے والا ہے تاہم ہندو وحدانیت مختلف عقائد کے بہت سے دیوتاؤں کو رد نہیں کرتی۔ بلکہ انہیں واحد کے اظہار کی حیثیت میں اپنے اندر شامل کر لیتی ہے۔

ہندوؤں کے خدا کو ہر جگہ موجود قادر مطلق ہر شے سے باخبر لامحدود رحم کرنے والا اور غیر شخصی طور پر شخصی بیان کیا گیا ہے۔ اس کی روح تمام کائنات میں مسلط ہے۔ وہ تمام صورتوں اور ناموں سے برتر ہے۔ وہ روح الارواح ہے۔ ہم اسی کے اندر زندہ ہیں اسی کے توسط سے وجود رکھتے ہیں۔ اور اس کے بغیر کچھ بھی ہست نہیں ہوسکتا۔ ہم اپنی سوچ کو مرکوز کرنے کے مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں تاکہ ان کی الوہی فطرت ہمارے اندر آ جائے۔ مختلف بت الوہی قوائیت کی علامتیں یا خدا کی خصوصیات ہیں جنہیں کسی بیرونی صورت کے بغیر سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ویدانت متعدد دیوتاؤں کی عبادت کرنے کا درس نہیں دیتا۔ بلکہ صرف ایک خدا کی پرستش کا کہتا ہے۔ جسے بہت سے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اور جو پجاریوں کی خواہشات کی مطابقت میں کسی بھی

صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس ہستی مطلق کو ہزاروں نام دیے گئے ہیں جو بے نام اور بے شکل ہے۔ وہ ماورائے ائنات نہیں بلکہ کائنات میں نافذ ہے۔ اور محیط کل ہونے کے ساتھ ساتھ ماوراء بھی ہے۔ وہ ثنائیت پسند کو روپ میں اور غیر ثنائیت پسند کو روپ کے بغیر نظر آتا ہے۔ وہ واحد ہے' تاہم اس کے پہلو متعدد ہیں۔ وہ شخصی' غیر شخصی اور ان دونوں سے ہی بالاتر ہے۔

سناتن دھرم

ہندومت کو ازلی دھرم (سناتن دھرم) خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے ازلی ہے کیونکہ صرف خدا ہی حقیقی ہے اور وہ ازلی ہے۔ یہ حقیقت مطلق جو محیط کل ہے کائنات کی مستعد اور مادی علت ہے۔ روح انسانی الوہی ہے اور کل کائنات روح مطلق کی تجسیم ہے۔ خدا ہمارے اندر ہے لیکن لاعلمی کی وجہ سے ہر آدمی کا اپنا مذہب ہے۔ چنانچہ انسان کا مذہب مانو دھرم کہلاتا ہے۔ یہ مانو دھرم ازلی مذہب ہے۔ کوئی شخص ہندو ہونے کے باوجود اپنے مذہب سے تو دور رہ سکتا ہے۔ لیکن اپنا مانو دھرم نہیں چھوڑ سکتا۔

ازلی مذہب یا ہندومت عقائد یا مسلک کے کسی مجموعہ پر نہیں بلکہ روحانی رفعت کے ذریعہ خدائی شعور کے حصول پر یقین رکھتا ہے۔ یعنی مطلق برہمہ ہونا اور بن جانا۔ ہندومت اس کے لیے ازلی ہے کیونکہ دیوتا مذہب کا مرکزی دھرا ہوتے ہوئے ازلی ہے۔

ہندومت میں آتما

ہندومت کسی پر بھی اندھا اعتقاد لاگو نہیں کرتا۔ یہ تحقیق کی راہ بند نہیں کرتا۔ بلکہ قطعی آزاد اور تعصبات سے پاک تحقیق کو تحریک دیتا ہے۔ ویدانت کے مذہب کو آتما (روح) کی سائنس کہا جاتا ہے۔ جیسے جدید سائنس کٹر عقائد کے ساتھ ہیں نمٹتی اور کسی شخص یا کتاب کی حاکمیت پر یقین رکھنے پر اصرار نہیں کرتی۔ بلکہ کائنات پر حکمران قوانین کو دریافت کرنے کے لیے مکمل طور پر امور فطرت کے صحیح مشاہدے اور تجربے پر انحصار رکتی

ہے۔اسی طرح ہندومت یا ویدانت مسالک یا عقائد کے ساتھ نہیں نمٹتا بلکہ منطق اور استدلال کے ذریعہ آتما کی صحیح فطرت واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اپنشد میں کہا گیا ہے کہ اس آتما کے متعلق سننا اس پر دھیان دینا اور اسے سمجھنا چاہیے۔

آتما کی سائنس اس قسم کے سوالات زیر بحث لاتی ہے۔کہ آتما جسم سے آزاد حیثیت میں موجود ہوسکتی ہے یا نہیں۔یہ موجودہ جنم سے پہلے وجود رکھتی تھی یا نہیں؟ یہ آزاد ہے یا محدود؟ چنانچہ اس کا تعلق آتما کی لافانیت ارادے کی آزادی اور پابندی اور قانون کرم وغیرہ سے ہے۔فلسفہ ویدانت انفرادی آتماؤ (جیو آتما) کے ایک انبوہ کثیر کی موجودگی کو تسلیم اور انہیں قادر مطلق آتما سے ممتاز کرتا ہے۔اپنشدوں میں دو آتماؤں کی بات کی گئی ہے۔حقیقی آتما اور ظاہری آتما۔حقیقی آتما دنیا کے ساتھ منسلک نہیں۔یہ جسم اور صورت کے بغیر دکھ اور خوشی سے ماورا ہے۔جبکہ ظاہری آتما دنیا کے ساتھ منسلک ہے۔یہ جسم اور صورت رکھتی ہے۔اپنے ہی برے یا اچھے اعمال کے نتیجہ میں مسرت یا دکھ جھیلتی ہے۔جب ظاہری روح دونوں روحوں کی یکجائی سے آگہی حاصل کر لیتی ہے تو اس کی تکلیف یا پابندی ختم ہو جاتی ہے۔

ہندومت جیو ایا مجسم فرد کی حقیقت نسبتی حالت میں تسلیم کرتا ہے۔اس کے مطابق روح موت کے بعد ایک نیا جسم دھار لیتی ہے۔اور اس نئے جنم کا تعین قانون کرم سے ہوتا ہے۔قانون علت ومعلول پر منحصر دوگارہ جنم کا عقیدہ روح کی نوعیت اور موت کے بعد اس کے اعمال کے حوالے سے تمام اندازوں میں سب سے زیادہ خوشنما ہے۔روح انسانی اپنے اعمال کے مطابق بار بار جنم لیتی ہے۔ویدوں کی رو سے انسان کو اپنی زندگی میں اپنی گزشتہ زندگی کے اعمال کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔روح اپنے اعمال کی سزا یا انعام میں بار بار اعلیٰ یا گھٹیا درجے میں جنم لیتی ہے۔صرف آزاد یا مکتی یافتہ روح ہی کوئی جسمانی روپ اختیار کرتی ہے۔

ذات کی تجسیم ظاہری اور حقیقی ہے۔چنانچہ اس کی پیدائش اور موت بھی محض ظاہری

ہے۔جیوآتما خودآگہی حاصل ہونے کے بعد برہمہ بن جاتی ہے۔لامحدود اور تکلیف کل۔آتما کو جان لینے والا شخص جیون مکت کہلاتا ہے۔وہ پابندی اور تکلیف سے آزاد ہو جاتا ہے۔موت آزاد روح کو ہراساں نہیں کرتی۔کیونکہ جسم کی حقیقت کپڑوں جیسی ہے۔آزاد روح ایک جسم میں رہتے ہوئے بیماری ضعیفی یا کمزوری کا تجربہ کرتی ہے۔ بھوک پیاس اور غم محسوس کرتی ہے۔لیکن انہیں ذرا بھی جسم ذہن یا حسیات کی کرداری خصوصیات کے طور پر جان لینے کے بعد وہ انہیں سنجیدگی سے نہیں لیتا۔آزاد روح لافانیت کے تحت زندہ رہتی ہے۔سوچتی اور کام کرتی ہے۔

تمام زندہ مذاہب میں ہندومت قدیم ترین ہے۔کسی ایک پیغمبر نے اس کی بنیاد نہیں رکھی،اور نہ ہی یہ کسی مخصوص گروپ کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔قدیم صحیفے ہندومت کے سرچشمے ہیں ان صحیفوں کو چھ عنوانات کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔(۱) شروتی (۲) سمرتی (۳) اتہاس (۴) پران (۵) آگم اور (۶) درشن۔شروتی کا لفظی مطلب ہے جسے سنا جائے۔عظیم رشی ابدی صداقتوں کو سنتے اور تجربہ کرتے تھے۔اور لوگ کی فلاح کے لیے اپنے تجربات قلم بند کردیتے تھے۔چاروں وید انہی پر مشتمل ہیں۔مکاشفے ویدوں کی صداقت ہیں وہ مذہب کا نہایت مستند منبع ہیں۔

''سمرتی'' کا لفظی مطلب ہے ''جسے یاد کیا جائے''شروتی کے بعد ان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔سمرتیوں کی بنیاد ویدوں کی تعلیمات پر ہے۔وہ مذہبی فرائض کی وضاحت اور تشریح کرتے ہیں۔وہ ضابطہ اور قوانین کے حصے متشکل کرتے ہیں جو افراد خاندانوں اور معاشروں کو روزمرہ زندگی میں راہنمائی دیتے ہیں۔

اتہاس یعنی تواریخ دو مشہور و معروف رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت پر مشتمل ہیں۔ان میں نہایت دلچسپ زندہ کہانیاں شامل ہیں۔جن کے ذریعہ ہندومت کی بنیادی تعلیمات لوگوں کے اذہان پر اپنے نقوش ثبت کرتی ہیں۔فلسفیانہ بحثوں کو علامتوں اور استعاروں میں پیش کیا گیا ہے۔

پران بھی اتہاسو جیسے ہیں ۔انہیں ویدوں کے مذہب کو مقبول بنانے کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے ۔پرانوں کا مقصد ویدوں کی تعلیمات کو اساطیر' کہانیوں حکایتوں اور رشیوں اور بادشاہوں کی علامتی کہانیوں کے توسط سے ایک ٹھوس شکل دینا ہے۔ وہ مذہب کو ٹھوس شکل میں پیش کرتے ہیں۔کل اٹھارہ پران ہیں جن میں سے بھگوت اور وشنو پران مقبول ترین ہیں ۔آگم بھی عوامی صحائف کی ایک قسم ہے۔اگرچہ وہ اپنا استناد ویدوں سے اخذ نہیں کرتے' لیکن ان کی تعلیمات کے مخالف بھی نہیں جاتے ۔ان میں دینیاتی مقالے اور پوجا کی عملی ہدایات شامل ہیں۔شیومت' شکتی مت اور ویشنو مت کے تین مرکزی فرقوں کی بنیاد آگموں کے عقائد پر ہے۔

درشن چھ ہیں ''درشن'' کا لفظی مطلب روشنی یا دیکھنا ہے ۔ چھ درشن یہ ہیں: (۱) نیایہ (۲) ویشنک (۳) سانکھیہ (۴) یوگ (۵) میماسا (۶) ویدانت ۔ ہر درشن صداقت کو دیکھنے کی ایک راہ پیش کرتا ہے۔انہیں انداز زندگی خیال کیا جاتا ہے۔

مرکزی طور پر وید اپنشد بھگوت گیتا اور چھ درشن ہی ہندو فلسفہ کے بنیادی صحائف اور ماخذ ہیں۔

ویدوں کا فلسفہ

رگ وید کے دور سے لے کر ہمارے عہد تک ہندو فکر اور فلسفے نے خیال کی وابستگی قائم رکھی ہے: ''وید بے ابد ہیں'' ۔ولسن کے الفاظ یہ ہیں: ''وید ہمیں عہد قدیم کی کثیر معلومات فراہم کرتے ہیں ۔

وید تعداد میں چار ہیں ......رگ' یجر' سام اور اتھرو ۔ پروفیسر میکس مولر کے مطابق رگ وید دنیا کی قدیم ترین کتاب ہے ۔ ہر وید تین حصوں پر مشتمل ہے (۱) منتر (۲) براہمن (۳) اپنشد۔ چار ویدوں میں رگ وید مرکزی ہے ۔ویدوں میں کچھ فلسفیانہ تفسریں موجود ہیں:

(۱) فطری پہلو

ویدک بھجن مختلف دیوتاؤں کی عبادات قدیم مذہب کے مخزن ہیں۔ ویدوں کی کچھ رسومات کا تعلق فطرت کی پرستش سے ہے۔ رگ وید کے مرکزی خدا فطرت کے وہ عظیم قوتیں ہیں جو انانی بہبود کو متاثر کرتی ہیں۔ اتھروو وید قدیم منتروں اور ٹونوں کا مجموعہ ظاہر ہوتا ہے۔ روگ وید میں لوگ کامل حالت کے لیے دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔

یہ دیوتا کو موسیقی، رقص مشروب (سوما) پسندیدہ کھانا (بشمول گوشت) مہیا کرتا ہے۔

ویدک آریاؤں نے متعدد دیوتاؤں کی پوجا کی: ایندر، اگنی، سوما اور دیگر یہ تین دیوتا بڑھتے بڑھتے ۳۳ بن گئے۔ اگنی آگ کا خدا ہے۔ وہ آگ جس کے بغیر تخلیق ممکن نہیں۔ ۲۰۰ سے زائد بھجن اس سے منسوب ہیں۔ یگیہ (بھینٹ) کو آگ میں ڈالنے سے بد اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اگنی دیوتا ہمیں راہ دکھاتا ہے۔ ہمارے دلوں اور جسموں کو گرمائش دیتا ہے ہمارے کھانے پکاتا ہے دشمنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہمیں نظر اور بصیرت دیتا ہے۔ ایندر رگ یود کا اہم ترین خدا ہے، تمام دیوتاؤں کا سردار۔ ابتدا میں وہ بارش کا دیوتا نظر آتا ہے۔ رگ وید کے تقریباً ایک چوتھائی بھجنوں میں سے ایندر کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ۱۱۴ بھجن سوما سے منسوب ہیں۔ سوما کو طاقت دلیری کے دیوتا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تمام قدی لوگ یہ سوما مشروب پیتے اور دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔

(۲) رسوماتی پہلو

یہ ویدوں اور ہنو مذہب کا عملی پہلو ہے۔ ویدک رسومات کے مذہبی پہلو کا مقصد بھجنوں اور یگیوں کے ذریعہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ رگ وید سمہتا میں کچھ بھجنوں کا مقصد بلاشبہ مخالف کے کھیت تباہ کرنا ہے اتھروو وید مقبول عام سحر، ہپناٹزم کالے جادو وغیرہ کے بارے میں ہمارے علم کا واحد ماخذ ہے۔ اتھرو وید سمہتا میں کچھ شادی کے بھجن ہیں اور کچھ موت کے۔

(۳) توحیدی پہلو

ویدوں میں خداؤں کے مسئلے کے حوالے سے عہد جدید کے محققین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔کہا گیا ہے کہ وید میں کثیر خداؤں سے واحد خدا کی جانب پیش قدمی موجود ہے۔ویدوں میں موجود خداؤں کا مطالعہ کرنے والا میکس مولر کوئی ایسی مناسب اصطلاح نہ ڈھونڈ پایا جو دیوتا کی فطرت پر موزوں بیٹھتی ہو۔ویدوں میں بہت سے دیوتا ہیں' اور عملی طور پر ان میں سے ہر ایک کو خدائے واحد اور خدائے مطلق کہہ کر پوجا گیا ہے۔

راجہ رام موہن رائے کے مطابق ویدک خدا استعاراتی طور پر مطلق دیوتا کی خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی ویدک بھجنوں کے مختلف دیوتے اور دیویاں ایک ہی دیوتا کے مختلف رخ ہیں۔

(۴) روحانی پہلو

ویدوں پر یقین کو غلطی سے عقائد پرستی نہیں سمجھنا چاہیے۔مذاہب اسی صورت میں قابل تقلید ہیں جب وہ روحانی ہوں۔ویدوں میں ایسے عظیم مرتاضیوں کے وجدانی تجربات موجود ہیں جو انہوں نے مذہب کے ذریعہ حاصل کیے۔ ہندوستانی فکر کے بارے میں رگ وید کو پڑھے بغیر بات نہیں کی جا سکتی۔ویدک دیوتے اور دیویاں نفسیاتی عمل کی علامتیں ہیں مثلاً سورج دانش کی علامت ہے۔جبکہ آگ اور سوما عزم اور احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔

(۵) اخلاقی پہلو

رگ وید میں ''ریت'' کا تصور نہایت زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ہمہ گیر اخلاقی نظام ویدوں میں رت ہے میماسا اور ادرشٹ میں نیا بہ ویشک متھرا اور رورانا جیسے خدا نہ صرف فطرت کا ضابطہ پیش کرتے ہیں' بلکہ کائنات میں اخلاقی نظم بھی قائم رکھتے ہیں۔ویدوں میں ریت ہمیں اخلاقیات کا ایک معیار مہیا کرتی ہے۔ یہ چیزوں کی

صداقت ہے۔

خدا کے قانون پر عمل کرنا نیکی ہے۔ جس میں انسان سے محبت بھی شامل ہے۔ وید انسانوں اور دیوتاؤں میں ایک بہت قریبی تعلق قائم کرتے ہیں انسان کی زندگی خدا کی نگاہوں تلے اپنا سفر طے کرتی ہے۔ اعتدال اچھی زندگی کی مرکزی خصوصیت ہے۔ ویدوں کا نیک آدمی اپنی راہیں نہیں بدلتا۔ نیک دلی اور مہمان نوازی کو عظیم نیکی خیال کیا گیا۔ المختصر ویدوں کا حتمی مقصد نوع انسانی کی فلاح ہے۔

اپنشدوں کا فلسفہ

صداقت کی تلاش اپنشدوں کا مرکزی موضوع ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن کہتے ہیں کہ اپنشدوں سے مراد ایسا علم ہے جو غلطیوں کو تباہ کر دے اور انسان کو صداقت تک رسائی حاصل کرنے کے قابل بنائے۔ شنکر کہتا ہے کہ ''برہمن کا علم اپنشد کہلاتا ہے''۔

اپنشدوں کے مرتاضیوں نے اپنے مذہبی تجربہ کے توسط سے علم (پراودیا) حاصل کرنا چاہی۔ ہمارے حواس ہمیں حقیقی علم نہیں دیتے۔ ذہن ہمیشہ دوئیوں (Dualities) کے درمیان حرکت کرتا ہے۔ کثرت میں واحد کی تلاش انسانوں کی فطری خواہش ہے۔

منڈک اپنشد کہتا ہے ''وہ کیا ہے جسے جان لینے سے ہر ایک چیز کو جانا جا سکتا ہے؟'' اپنشدی فلسفے کے مرتاضوں نے زندگی بھر مابعد الطبیعاتی مسائل پر سوچ بچار کی۔ انہوں نے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے حقیقت مطلق کو تلاش کیا اور حقیقت کو پوری طرح جان لینے تک اپنی جستجو جاری رکھی۔

اپنشدوں کے مطابق برہمہ حقیقت مطلق ہے۔ برہمہ اور لامحدود ازلی و ابدی ہر شے پر قادر ہر شے سے باخبر اور خود آگاہ ہے۔ وہ روح الارواح ہے۔ برہمہ وہ لطیف جوہر ہے جو ساری زندہ اور بے جان دنیا پر محیط ہے۔ میتری اپنشد کے مطابق ''وہ جس میں سے تمام چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ جس میں زندہ رہتیں اور انجام کار فنا ہو کر جس میں واپس جائیں گی۔ بریہد آرنیک اپنشد میں کہا گیا ہے کہ سورج چاند آکاش زمین دن رات

سال' مہینے' سمندر' دریا وغیرہ سب برہمہ کے حکم کی وجہ سے باقاعدگی سے چلتے ہیں۔

برہمہ لامحدود ہے۔ یہ محیط کل ہونے کے ساتھ ساتھ ماورا بھی ہے۔شویتا شویتر اپنشد میں خدا کو ایک ہی جملے میں بیک وقت محیط کل اور ماورا بیان کیا گیا ہے ''خدا آسمان میں ایک درخت کے مانند چپ چاپ کھڑا ہے اور پھر بھی ساری کائنات میں سمایا ہوا ہے۔

بھگوت گیتا کا فلسفہ

بھگوت گیتا کرم (عمل) اور جنان (علم) اور بھگتی اک ایک امتزاج پیش کرتی ہے۔اگر چہ یہ ہندومت کی ایک مذہبی کتاب ہے لیکن حقیقتاً اسے دنیا کے تمام مذاہب قبول کرتے ہیں۔یہ کتاب ہندوؤں میں بہت مقبول ہے۔ گیتا دراصل مہابھارت کا ہی ایک حصہ ہے۔بھگوت گیتا کا پیغام اپنی وسعت کے اعتبار سے کائناتی ہے۔ یہ مقبول عام ہندومت کی فلسفیانہ بنیاد ہے۔ولیم وان ہمبولڈٹ کے مطابق ''گیتا کسی بھی زبان میں موجود شاید واحد خوبصورت ترین فلسفیانہ گیت ہے''۔لوک مانیہ تلک نے اسے نہایت چمکدار اور کامل موتی کہا جو بے چین روحوں کو سکون دیتا اور ہمیں روحانی دانش میں کامل بناتا ہے۔ گیتا کی مرکزی تعلیم کو اپنی بیسانت کے خوبصورت مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔اس کا مقصد متلاشی کو تیاگ کی کمتر سطوحات' جہاں چیزوں کو تیاگ دیا جاتا ہے۔ سے اٹھا کر پرشکوہ بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ جہاں خواہشات انسانی مر جاتی ہیں۔اور یوگی پرسکون اور مسلسل مراقبے میں قیام پذیر ہوتا ہے۔جبکہ جسم اور ذہن مستعدی کے ساتھ زندگی کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف رہتے ہیں''۔

عمل' علم اور بھگتی کا امتزاج

بھگوت گیتا خدا کو اس دنیا کی مطلق علت اور بنیاد تسلیم کرتی ہے۔خدا کو ایشور اور برہمہ جیسے القاب سے بیان کیا گیا ہے۔تاہم یہ قابل ذکر ہے کہ شری کرشن نے خود کا کافی جگہوں پر دیوتا کے متشابہ کہا اور اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ''میں'' یا

''میرا'' جیسے الفاظ کا آزادانہ استعمال کیا ہے۔۔وہ دو فطرتوں (پراکرتی) کا حامل ہے...... پراپراکرتی اروا پراپرکرتی۔اول الذکر جانداروں پر مشتمل ہے۔جبکہ موخرالذکر میں تین گن (خصوصیات) شامل ہیں ستورج اور تمس۔زندہ ہستی کو خدا نے جز''انش'' کے طور پر بیان کیا ہے۔تاہم وہ درحقیقت آتما ہیں۔بے پیدائش' غیر فانی اور ابدی۔ آتما کپڑوں کی طرح انسانی جسم بدلتی ہے۔جسموں کو کھیت (کشیتر) کہا گیا ہے کیونکہ اعمال کے پھل ان میں ہی پکتے ہیں جاندار ہستیاں' جو بنیادی طور پر آتما ہیں' لاعلمی کی وجہ سے خود کو جسم سے ہی متشابہہ سمجھ لیتی ہیں۔اور نتیجتاً پیدائش' بیماری' بڑھاپے اور موت کی تکالیف جھیلتی ہیں۔

گیتا کی تین راہوں کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔سب سے پہلے راہ علم ہے۔گیتا انسان کو خود آگہی یعنی اپنی حقیقت جاننے میں مدد دیتی ہے۔یعنی اپنی آتما کو جاننا دوری راہ عمل کی ہے۔گیتا کے اس بارے میں تعلیم یہ ہے کہ پھل کی خواہش سے لاتعلق ہو کر' بے لوث خدمت کرو۔بھگتی تیسری راہ ہے جس میں انسان خدا کے لیے شدید تمنا یا محبت پیدا کرتا ہے۔ہم ایسی زندگی گزار سکتے ہیں کہ جس میں علم عمل اور بھگتی تینوں کا اپنا اپنا مناسب اور جائز مقام ہو۔گیتا یوگ یا روحانی زندگی کو بانظم کل کے طور پر لیتی ہے۔جس میں ہمارا ارادہ (کرم یوگ) ہمارے جذبات کی تربیت (بھگتی یوگ) اور ہماری دانش کی تربیت (جنان یوگ) شامل ہے۔ان تینوں اصولوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔

کرم یوگ بھگتی کا ایک عنصر موجود ہے۔کرم یوگی ہمیشہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا کا خادم ہے۔بھگتی کے بغیر کوئی بھی عمل کرنا ناممکن ہے۔کرم یوگ خدا کو عامل سمجھتا ہے اور خود کو محض خدا کا ایک آلہ کار۔وہ تمام اعمال خدا کی خاطر سرانجام دیتا ہے اور ان کے نتائج بھی خدا پر چھوڑ دیتا ہے۔اسکے لیے کام عبادت ہے۔بھگتی کرم یوگ کا مافیہ ہے۔

خدا کے لیے غیر مشروط سپردگی اور ہم آہنگی کا نام وابستگی ہے۔گیتا کہتی ہے ک ایک

پلڑے میں کرم یوگ اور دوسرے میں جنان یوگ سے حقیقی بھگتی ہمیشہ متوازن رہتی ہے ۔یعنی حقیقی بھگتی میں ہمیشہ ایک جانب اخلاق آ گہی اور دوسری طرف تیاگ ہوتا ہے ۔بھگتی کبھی بھی اندھا دھند نہیں ہوتی ۔ یہ خدا کے ساتھ معقول محبت ہے جس طرح کرم یوگ میں بھگت کا ایک عنصر موجود ہے بالکل اسی طرح بھگتی میں جنان (علم) کا عنصر پایا جاتا ہے۔

گیتا کی رو سے جنان میں ذہن ودل کی مختلف نیکیوں کی انجام دہی شامل ہے جو متمنی کو جنان تک لے جاتی ہے۔راہ علم پر گامزن متمنی کو یہ محسوس کرنا پڑتا ہے کہ دنیا راب ہے جبکہ صرف برہمہ حقیقی ہے۔برہمہ علم حقیقی ہے جسے آتما کہتے ہیں۔اس خود آ گہی کے ذریعہ انسان بھگتی حاصل کرتا ہے۔جنان یوگ فلسفیانہ عقیدے کی استدلالی توضیح ہے۔

ہندو فلسفہ کے مکاتب

ہندو فلسفہ میں چھ بنیادی نظام ہائے فلسفہ پیدا ہوئے ۔ویشش‍ک نیا یہ سانکھیہ یوگ میماسا اور ویدانت ۔

کناڈی اپنی کتاب ویشش‍ک فلسفہ میں ابتدائے کائنات کی کڑیاں ایٹموں اور مالیکیولوں کے امتزاج سے ملاتا ہے۔اس کے مطابق ایٹم اور مالیکیول خدا کے تخلیق کردہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہم ازل ہیں۔دو ایٹموں کو ملانے اور ان کا مجموعہ بنانے والی طاقت خدا میں سے آتی ہے۔جو شخصی ہے۔وہ علم خواہشات اور رارادے کا حامل ہے اور خدا تمام مظہر کا مالک ہے۔اس نظام فلسفہ کی رو سے اثیر (Ether) زماں' مکاں' نفس اور ذہن فطرت کے ازلی وابدی مرکبات ہیں۔نجات یا موکشا کا مطلب جنم مرن اور دکھ‌بنے کے چکروں سے آزادی پا جانا ہے۔

اس کے بعد گوتم کا نیا یہ فلسفہ آتا ہے اس کا معروض فطرت' روح اور رخدا کا حقیقی علم' اور حتمی آزادی کا حصول ہے۔

کپل کا سانکھیہ نظام ذات اور لاذات پرش اور پراکرتی یا ابدی قوت کے منطقی

ملاحظے پر غور وخوض کرتا ہے۔کپل نے خالق کے وجود سے انکار کیا' لیکن وہ انفرادی روح کو بطور ابدی لامحدود اور لافانی شے تسلیم کرتا ہے۔اس کے خیال میں حتمی نجات علم کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے۔

پتنجلی کا فلسفہ یوگ خود کو انسانی ذہن کی بلند ترین نفسیات کے لیے وقف کرتا ہے اور ارتکاز خیال ومراقبہ کی سائنس' سانس لینے کی سائنس' ٹیلی پیتھی' غیب دانی اور دیگر مختلف نفسی قوتوں کی وضاحت کرنے کے علاوہ ہمیں الوہی شعور (سمادھی) حاصل کرنے کی ایک راہ بتاتا ہے۔دنیا میں یوگ کا کوئی نظام پتنجلی نظام جتنا مکمل نہیں۔خدا کی بھگتی اور عملی تربیت وانضباط کو نجات حاصل کرنے کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔

پورو میماسا جیمنی کے فلسفہ کا ایک بنیاد پرست مکتبہ ہے' جو ویدوں کے حقیقت پسندانہ حصے (کرم کانڈ) کے مختلف فرامین پر غور کرتا ہ۔ان فرامین پر ہر ممکن سختی کے ساتھ عمل کرنے کو اعلیٰ ترین فرض بتایا گیا ہے۔اس نظام کو کرم یا حقیقت پسندانہ عمل کا فلسفہ کہا جاسکتا ہے۔یہ علم کے معتبر ذرائع' لفظ اور خیال کا درمیانی رشتہ واضح کرتے ہیں۔

سب سے آخر میں ویدانت' جسے عام طور پر شنکر اچاریہ کا ادویت ویدانت کہا جاتا ہے' ویدوں اور اپنشدوں کے مطالعہ تک ہی محدود ہے۔ویدانت کا لفظی مطلب علم (یا ویدوں) کا انت ہ۔آج کل یہ ہندوستان کا مقبول ترین فلسفہ ہے۔موحدانہ ادویت ویدانت فلسفہ تمام قابل ادراک معروضات سے ماورا کی جانب ہماری رہنمائی کرتا ہے اور ہماری روح کو ابدی' مطلق ہستی کی جانب متعین کرتا ہے جہاں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

ادویت ویدانت کے مطابق صرف برہما حقیقی ہے' اور دنیا غیر حقیقی' برہما واحد ہے نہ کہ کثیر۔اس واحد سے بہت سے وجود میں آئے' اور انفرادی روحیں مطلق برہمہ ہیں۔ مظہری کائنات مطلق برہما سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور اسی میں واپس لوٹ جاتی ہے۔

ویدانت کے دوئی پسند نظریہ میں رامانج نے کہا کہ دنیا خدا (برہما) اور روحیں حقیقی

ہیں۔ ہماری لاعلمی قید اور تکلیف کی وجہ ہے۔ حقیقی علم کے ذریعہ لاعلمی کا خاتمہ ہو سکتا ہے، جسے برہماجنان یعنی الوہی آگہی کہتے ہیں۔ مکتی مسرت و شادمانی کی حالت ہے جس میں ذات خود کو برہما جیسا ہی بنا لیتی ہے۔

ہندومت عہد جدید میں

ہندومت ایک قدیم ترین مذہب ہے لیکن یہ مختلف صورتحال میں اپنی تجدید کرتا رہا ہے۔ ہندو مذہب کو جب بھی داخلی یا خارجی خطرہ لاحق ہوا تو اس میں ہمیشہ تبدیلی و ترمیم ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند سرسوتی، سری رام کرشن اور دیگر مجددین نے وقتاً فوقتاً ہندومت کی تجدید کی ہے۔ یہاں چند ایک مذہبی تحریکوں اور اصلاح کاریوں پر بحث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو ہندومت میں وقوع پذیر ہوئیں۔

برہمو سماج

جب ہندوستان برطانوی حکومت کے ماتحت تھا تو عیسائی مبلغین نے ہندوؤں کے درمیان اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی۔ ہندو مذہب اور عقیدہ ہل کر رہ گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کا آغاز کیا۔ انیسویں صدی کے دوران راجہ رام موہن راء نے سائنس کی پیاس، استدلال سے محبت اور آزاد انسان پسندی کے ساتھ ہندومت کی ایک نئ روح پیش کی۔ برہمو سماج نے ہندومت میں سے کثرت پرستانہ عقائد کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی، اور یوں ''ابدو بے شکل خدا'' میں اعتقاد بحال کیا جو ساری کائنات کا خالق اور اسے قائم رکھنے والا ہے۔

راجہ رام موہن رائے نے عیسیٰ مسیح کی الوہیت کے مسلک کو مسترد کر دیا، لیکن وہ عیسیٰؑ کی اخلاقی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہندومت کے بنیادی عقائد میں سے آواگون، بچوں کی شادی، بیوہ کی شادی نہ کرنے کی رسم اور اچھوت پن کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے بت پرستی کی مخالفت کی جس نے وحدانیت یا ہندومت کے نظریہ واحد

خدا کو بے وقعت بنا دیا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہندو صحائف صرف واحد مطلق پر یقین کی تعلیم دیتے ہیں۔ رام موہن رائے نے اہم مکتب اوراویدانت و اپنشدوں سے متعلق کتب شائع کیں اور مذہبی و سماجی اصلاح کے لیے لوگوں کے درمیان تقسیم کیں۔

ہندوستان بھر میں برہمو سماج کی بہت سی شاخیں قائم ہوئیں اور رابندر ناتھ ٹیگور و چندر سین نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ہندومت میں سے توہم پرستی اور اندھے اعتقادات وغیرہ کو خارج کر کے اسے خالص بنانا چاہا۔ بعد میں برہمو سماج تین حصوں میں تقسیم ہو گئی (۱) آدی (۲) نواندھان (۳) سدھارن برہمو سماج۔

آریہ سماج

آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے بمبئی میں ۱۰ اپریل ۱۸۷۵ء کو رکھی۔ یہ برہمو سماج کے مقابلہ میں زیادہ بنیاد پرستانہ اور تشددانہ تھی۔ سوامی دیانند سرسوتی نے برہمو سماج پر الزام عائد کیا کہ وہ عیسائیت کی تقلید میں قدیم ہندو روایت سے بہت دور ہو گئی تھی۔ آریہ سماجی نے ویدوں کو اپنی ٹھوس بنیاد بنا کر نہ صرف عیسائیت اور اسلام بلکہ مغربی سائنس کے کچھ مخصوص پہلوؤں پر بھی تنقید کی۔ سوامی دیانند کو یقین تھا کہ وید غیر متزلزل اور لامحدود علم کا خزینہ ہیں۔ لہٰذا ویدوں کو سمجھنا اور ان کی تعبیر وتشریح کرنا ضروری قرار دیا گیا' کیونکہ ان میں معلومات فلسفہ اور تکنیکی و سائنسی علم شامل ہے۔ اس کا نعرہ ''ویدوں سے رجوع'' قومی یک جہتی بنانا اور ہندوؤں کے درمیان قومی وقار اور شعور کی شمع روشن کرنے کی حقیقی خواہش سے تحریک یافتہ تھا۔ اور اس کا مقصد ہندومت کی تجدید واصلاح کاری تھا۔

خود دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کے اصول مندرجہ ذیل بیان کیے ہیں:

(۱) تمام علم اور معلوم کی اولین مستعد علت پرم ایشور یعنی خدائے مطلق ہے۔

(۲) خدا ہستی موجود ذہین اور کامل مسرت ہے۔ وہ بے ہیئت قادر مطلق' منصف'

رحیم' لاولد' غیر محدود' غیر متغیر' بے ابتدا' یکتا سب کو قائم رکھنے والا' مالک کل' حاضر مطلق' خلقی نا قابل تغیر' لافانی' بے خوف' ابدی اور خالق کل ہے۔

(۳) وید حقیقی علم کے صحائف ہیں۔ انہیں پڑھنا' سیکھنا اور ان کا ورد کرنا اور دوسروں سے سننا سب آریوں کا فرض ہے۔

(۴) حقیقت کو قبول اور غیر حقیقی کو مسترد کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(۵) آریہ سماج کا بنیادی مقصد ساری دنیا کی بھلائی ہے' یعنی اس کی مادی' سماجی اور روحانی بہتری میں مدد کرنا۔

(۶) سب انسانوں کے ساتھ برتاؤ محبت اور انصاف کے تحت' دھرم کے اصول کی مطابقت میں ہونا چاہیے۔

(۷) ودیا (موضوع و معروض کا علم) کو فروغ دینا اور اودیا (سراب) کی بیخ کنی کرنی چاہیے۔

(۸) صرف اپنے فائدے اور بہتری کے لیے نہیں بلکہ سب کے فائدے اور بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

(۹) معاشرے کی بے غرضانہ حکمرانی پر عمل کرتے ہوئے خود کو پابند سمجھنا چاہیے' جبکہ انفرادی فلاح کے اصولوں کی پیروی میں آزاد ہونا چاہیے۔

سوامی دیانند صرف ایک دیوتا پر یقین رکھتے تھے اور انہوں نے کہا کہ وید بت پرستی کی اجازت ہرگز نہیں دیتے۔ ان کے لیے خدا صداقت ہے۔ گاندھی کا بھی یہی نظریہ تھا۔ آخری فتح حق ہی کی ہوتی ہے۔ اور یہ اپنے متلاشیوں کے لیے ''دھرم'' ارتھ کام اور نجات کو یقینی بناتا ہے صداقت کی بھگتی لازماً قوت اور عظمت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ آریہ سماج انسانی نوع کی جسمانی' روحانی اور سماجی بہبود کے لیے حقیقی علم محبت اور انصاف کو بنیاد بناتی ہے۔ سوامی جی نے کہا کہ ساری دنیا کی بھلائی آریہ سماج کا بنیادی مقصد ہے۔ انہوں نے زیادہ تر اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ہمہ وقت سچائی کو قبول اور

جھوٹ یا غیر حقیقی کو مسترد کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ساجی مذہبی اصطلاح میں سوامی دیانند نے کسی بت پرستی' اجداد پرستی' ذات پات' جانوروں کی قربانیوں' اوتاروں' زیارتوں' بچوں کی شادی اور اچھوت پن کے علاوہ بیوہ کی شادی کرنے کی بھی تبلیغ کی۔

رام کرشن کا مشن

رام کرشن ہندو معاشرے کے سامنے ایک شدید روحانیت سے بھرپور مظہری زندگی کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے۔انہوں نے ہندو الہیات کے نظریات اور تصورات کی نہایت سادہ اور بصیرت افروز تعبیر و تشریح پیش کی۔

مہاتما گاندھی نے کہا کہ شری رام کرشن کی زندگی عملی مذہب کی کہانی ہے۔را کرشن کے مطابق دنیا کے مختلف مذاہب یعنی ہندومت عیسائیت اسلام وغیرہ ایک دوسرے کے متضاد یا مخالف نہیں بلکہ ایک ہی ازلی و ابدی مذہب کے متعلق ادوار ہیں۔رام کرشن کے الفاظ میں ''جتنے عقیدے ہیں اتنے ہی راستے بھی ہیں'' رام کرشن کو مجسم صداقت و پاکیزگی تسلیم کیا جاتا ہے۔

انہوں نے ہندومت کی موجودہ حالت پر غور و خوض کیا۔ ان کے متعدد روحانی شاگرد اور مرید تھے۔جن مُیں سے سوامی دیوکانند سب سے زیادہ قابل تھے۔سوامی دیوکانند کے مطابق جب آریوں کی اولادیں ویدانت اور اپنشدوں کی روح کو فروغ دینے میں ناکام ہو گئیں اور مذہب کی سرزمین ہندوستان کو غیر معمولی گڑبڑ سے بھرپور بنا دیا تو شری کرشن آریہ نسل کا حقیقی مذہب افشا کرنے کے لیے نمودار ہوئے۔وہ مذہبی سوچ ارو پوجا کے تمام تصورات اور پہلوؤں میں موافقت کے طور پر آئے' اور ان کی زندگی ماضی کی تمام عظیم مذہبی شخصیات کی نو تشکیل شدہ تجسیم تھی۔تاہم یہ ایک چیلے کے اپنے گرو کے متعلق خیالات ہیں۔

ویوکانند نے اپنے اہل وطن کو فلسفہ ویدانت پر عمل کرنے اور دنیا بھر میں اس کی اشاعت پر زور دیا۔کیونکہ ان کے خیال میں عالمی مسائل کا یہی ایک حل تھا۔

سوامی وید کانند کو پورا یقین تھا کہ ہندو روحانیت اس وجہ سے اعلیٰ ترین ہے کہ یہ عظیم ادویت (غیر ثنائیت) کو حقیقت میں پیش کرتی ہے' اور اسے پانے کے ذرائع بھی ایک اصلاح کار کی حیثیت میں دیو کانند نے ہندو معاشرے میں سماجی اور اقتصادی برابری کی جدید روح پھونکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو فعالیت اور سماجی خدمت کی تربیت دی۔ یہی ان کا مشن تھا۔

مہاتما گاندھی' سری آروبندو گھوش اور ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشن ہندومت میں اصلاح کے دیگر فلسفی مبلغین اور دانش ور گزرے ہیں۔

☆☆☆

۱۴ :: یہودیت

''ہر مذہب' اور خاص طور پر یہودیت' نجات کی جستجو کے لیے
لوگوں کی تنظیم ہے''۔ (مورڈیسائی کاپلدن)

یہودیت اہل یہودہ کا قدیم مذہب تھا۔عہد نامہ عتیق میں یہودیت کا مرکزی ماخذ ہے یہودیت نے فطرت کی دہشت زدہ عبادت سے فطری انداز میں ترقی پائی اور کثر پرستی سے وحدانیت تک آیا۔ ابراہیم اور موسیٰ خوراک کی تلاش میں کانہ بدوشوں کی طرح فلسطین اور مصر میں جگہ جگہ گھومے۔ زندگی کے لیے ضروری خوراک اور کے سرچموں کو نادیدہ قوتیں سمجھا جاتا تھا اور جو اپنی حیات پرور خصوصیات کی وجہ سے نہایت قابل قدر یا قابل عبادت تھیں۔ چنانچہ دریاؤں اور چشموں کے ماخذ جنہیں ''جبل'' کہا جاتا تھا۔کو ان کی روحانی قدر کی وجہ سے اہمیت دی جاتی تھی۔ ابر اور موسیٰ نے بالترتیب کوہ شداۓ کوہ سینائی کو اپنے دیوتاؤں کے طور پر اپنایا۔ میں زندگی کی طمانیت نے ہی انہیں علم مہیا کیا۔ ان دنوں کامیابی کا راز کسی زیادہ دیوتا کے ساتھ الحاق حاصل کرنا تھا۔ کچھ محققین کے مطابق یہودیت دو مذاہب عیسائیت اور اسلام کا مرکب ہے۔

دس فرمان

موسیٰ کو یہودیوں کو مصر سے باہر لے گئے۔ وہ یہودیت کو منظم کرنے اور انہیں نیا ضابطہ اخلاق اور معیار زندگی دینے میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس میں تحت انہوں نے اپنے لوگوں پر دس فرمان صادر کیے:

۱۔ خداوند تیرا خدا جو تجھے **ملک** مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں۔

۲۔ میرے حضور تو غیروں کو معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے......

۳۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔

۴۔ یاد کر کے تو سبت کا دن پاک ماننا۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنا سارا کام کاج کرنا لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے۔ اس میں تو کوئی کام نہیں کرے گا۔

۵۔ تو اپنے باپ اور ماں کی عزت کرنا تا کہ تیری عمر اس **ملک** میں جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو۔

۶۔ تو خون نہ کرنا۔

۷۔ تو زنا نہ کرنا۔

۸۔ تو چوری نہ کرنا۔

۹۔ تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا۔

۱۰۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کرنا۔ تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا اور نہ اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے کا' اور نہ اپنے پڑوسی کی کسی بھی چیز کا لالچ کرنا۔

یہودیت میں خدا کا تصور

یہودیت کی رو سے خدا تمام قوت کا سرچشمہ ہے اور جوہر ہے۔ وہ کائنات کا خالق اور حکمران ہے۔ تمام ہست اس کا تخلیق کردہ ہے اور وقوع پذیر ہونے والا سب کچھ اس کا کارنامہ۔ اس کی قوتیں صرف اس کے ارادے سے ہی محدود ہیں۔ ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ خدا قادر مطلق اور عالم کل ہے۔ وہ ہمہ ساعت' ہمہ بصارت اور علیم اور خبیر ہے۔ وہ ابدی اور زمان ومکان سے ماورا ہے۔ یہودیت دو جدا قسم کی الوہی خصوصیات تسلیم کرتی ہے۔ اول یہ کہ خدا ایک ماورائی ہستی کے طور پر نظر آتا ہے۔ جو خود کو ہماری تفہیم میں لاتی ہے۔ دوم یہ کہ خدا کی پاکیزگی اسے اخلاقی لحاظ سے کامل بناتی ہے۔ خدا

اعلیٰ ترین اخلاقیات کے لیے بھی مثالی نمونہ بن جاتا ہے۔ پاکیزگی کی یہ الوہی خصوصیت دوہرے معنی رکھتی ہے۔ پہلا معنی ہر عارضی اور حیاتی چیز سے ماورا روحانی فوقیت ہے۔ اس سے خدا کی پاکیزہ بنانے والی قوت مراد ہے۔ دوسرا معنی خدا کے ملتفت ترحم کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

انسان خدا کے ساتھ خصوصی تعلق کا حامل ہے۔ اس کا اظہار اس فقرے میں ہوتا ہے کہ ''انسان کو خدا نے اپنی شکل جیسا بنایا'' انسان کو خدا کی طرف سے دی ہوئی روح کا حامل سمجھ کر تعظیم دی گئی۔ یہ امر انسان اور خدا میں ایک شخصی تعلق قائم کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو زمینی اور روحانی خصوصیات ودیعت کی ہیں اور اسے خدا کے مقاصد کی تعمیل میں حصہ لینے کا کہا گیا ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے خدا نے تمام دنیا اور تمام موجودات کو بنایا لیکن اس نے کی ترقی کی ذمہ داری انسان کو سونپی۔ انسان کو زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کو ترقی دینے کی ذمہ داری بھی دی گئی۔ انسان پر زور دیا گیا کہ وہ پاکیزگی تک پہنچانے والی تمام مثبت نیکیاں سرانجام دے۔ بائبل میں ان کا اظہار خدمت اور فرض خیرات دینے اور انسانوں سے محبت پر تاکید کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہودیوں کے مطابق خدا جیسا بننے کی جدوجہد کرنا اصل مقصد ہے۔ خدا اچھا راستباز منصف اور رحیم ہے لہذا انسان میں بھی یہ وصف موجود ہونے چاہئیں۔

یہودیت میں اخلاقی اصول

یہودیت کے مطابق زندگی اخلاقی تگ و دو کا نام ہے اور انسان کو خدا کی الوہی سرگرمیوں میں اس کا رفیق کار بننا ہوتا ہے۔ الوہیت' خدا کی برابری' بے لوث ہو کر نیکی کرنا یہودیت میں انسانی وجود کا اصل مقصد ہے۔ یہودیت نے انفرادی تکمیل کے لیے ایک ضابطہ طرز مقرر کیا ہے۔ انسان پر زور دیا گیا ہے کہ وہ ناپاک خواہشات اور گناہگار جذبات پر فتح پائے اور ہر قسم کی تحریص کی مدافعت کرے۔ تزکیہ نفس اور ترک دنیا انسانی ترقی کا پہلا مرحلہ ہے جس کے ذریعہ سے تکمیل ذات ہوتی ہے۔ تزکیہ نفس کے اعلیٰ

ترین صورت وہ ہے جو خدا کی علت میں ظاہر ہوتی ہے۔خدا یا انسانوں کی راہ میں نفس کشی' ترک دنیا اور ایثار ذات کا ہر اقدام کاملیت کی جانب لے جاتا ہے۔ یہودیت کی اصل روح انسان کو دنیا سے بھاگنے اور ریاضت کش بن جانے کی تعلیم دینے میں مضمر نہیں خدا نے نوع انسانی کو اصول وقوانین کا ایک مجموعہ دیا جس پر عمل کر کے ہر انسان الوہی منشاء کی تکمیل میں شریک کار بن جاتا ہے۔ یہ پابندیاں مندرجہ ذیل ہیں: (۱) صنم پرستی (۲) خدا کی شان میں گستاخی (۳) تزویج محرمات (۴) قتل (۵) چوری (۶) زندہ جانور کی ٹانگ کاٹ کر کھانا اور (۷) بے انصافی۔

یہودیت کا جوہر اس آیت میں ہے ''تم میرے لیے پاکیزہ بنو کیونکہ میں تمہارا خداوند پاک ہوں' خدا اخلاقیات اور کاملیت کا مثالی نمونہ ہے جو یہودیوں کو حصول کاملیت اور ایک نیک زندگی گزارنے کے لیے قوت محرکہ اور ترغیب دیتا ہے۔ المختصر یہودی اخلاقیات پاک خدا کی سرفراز کرنے والی قوت کے تحت خود فرازی فراہم کرتی ہے انسان کو چاہیے کہ وہ خدا جیسا بن کر خدا کی راہ پر چلے انسانی زندگی الوہی نیکی اور پاکیزگی کا نقش ثانی ہونی چاہیے۔صاف ہاتھوں اور پاک دل والا انسان' جس کی روح غلط راہ پر نہ پڑی ہو اور نہ ہی اس نے دھوکہ دیا ہو' خدا کا مقام پا سکتا ہے۔ حفظ نفس اور تکمیل ذات ہر یہودی کے بنیادی فرائض ہیں۔ ہماری اخلاقی اور روحانی ذات کے لیے قول ہے کہ ''پہلے خود کو اور پھر دوسروں کو خوبصورتی دو''۔

یہودیت اخلاقیات اور کامل طرز عمل کی تعلیم دیتی ہے۔زندگی خدا کے لیے' ہر قسم کی بے انصافی کے خلاف حق کے لیے جھوٹ کے خلاف سچائی کے لیے' ناپاکی کے خلاف پاکیزگی کے لیے جدوجہد ہے۔ یہ نیکیوں انکساری' تسلیم و رضا' مویشیوں پر شفقت' راحت رسانی' ہم آہنگی اور اعتدال کا مذہب ہے۔امن الوہی خصوصیات کی روح اور انسانی کاملیت کی علامت ہے۔اس دنیا میں اور نہ ہی اگلی دنیا میں راست باز کے لیے کوئی سکون ہے کیونکہ وہ ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جاتے اور مسلسل جدوجہد

کرتے ہیں۔اور وہی خدا کو پاتے ہیں۔راست بازی میں خیرات دنیا اور کریم النفسی بھی شامل ہے۔

عمل اور دوبارہ جنم کا قانون

ہندومت کی طرح یہودیت میں بھی قانون عمل اور دوبارہ جنم پر زور دیا گیا ہے۔اگر کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو اسے انعام ملتا ہے جبکہ برے کام سزا کا حق دار بناتے ہیں چنانچہ ہر شخص کو اپنے اعمال کی بنیاد پر وہ پھل ملتا ہے۔کام کرنا انسان کا اولین مقصد ہے کیونکہ کام عبادت ہے کام زندگی ہے ارکام ہی نجات کی راہ ہے۔یہ بات یہودیت میں عقیدہ دوبارہ جنم کی بنیاد بنی۔عمل اور دوبارہ جنم کے یہودی نظریات کا تجزیہ روح کی فطرت کی دریافت تک لے جاتا ہے۔یہ اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ روح ابدی اور نا قابل فنا ہے۔اس کی نوعیت غیر تبدیل شدہ رہتی ہے۔چاہے یہ کتنی بار ہی کیوں نہ جنم لے۔

مسئلہ شر

یہودیت کی رو سے برائیاں اور گناہ انسان میں خلقی ہیں۔رحیم راستباز پاکیزہ اور شر سے پاک خدا اس کائنات کی واحد علت ہے۔گناہ اور شر انسانی ذہن کی آلودگی کے باعث ہیں۔گناہ خدا کے ساتھ عدم تعلق کا احساس پیدا کرتا ہے۔خدا گناہگار کو سزا نہیں دینا چاہتا بلکہ اسے اپنی جانب واپس لانا چاہتا ہے۔یہ عقیدہ کہ خدا دعا سنتا ہے اور اگناہگاروں کو بخشتا ہے خدا اور انسان کے درمیان باہمی تعلق کی بنیاد پر ہے۔دعاؤں کے ذریعہ الوہی رحمت حاصل کی جاسکتی ہے۔دعا اور پچھتاوا ہی روح انسانی اور خدا کے درمیان حائل وسیع خلیج پر پل بنتا ہے۔

یہودی فلسفہ

یہودی عقیدہ زندگی کے اخلاقی قانونی اور انتہائی مذہبی پہلوؤں کے بارے فلسفیانہ دعوے کر چکا ہے خدا یہودیت کا مرکزی نکتہ ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا

اسرائیل کو ایک خدا کی عبادت اور دوسروں کو خارج کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس صورتحال میں وحدانیت پیدا ہو جانا قرین قیاس تھا۔ یہودی فلسفہ نے زندگی کے اخلقی اور مذہبی پہلوؤں پر زور دیا ہے۔ یہ ہر فرد کو کاملیت حاصل کرنے کے لیے ایک اخلاقی ضابطہ تجویز کرتا ہے۔ یہودیت کی نظر میں انصاف انسانی رویے کا سب سے بڑا اصول ہے صرف عمل میں ہی نہیں بلکہ سوچ اور روح میں بھی انصاف درکار ہے۔ انصاف محبت بد معاملگی تک پہنچاتی ہے۔ محبت کو انصاف کی رہنمائی کرنی چاہیے ورنہ یہ بے قدر ہو گی۔

عہد وسطیٰ کے سب سے بڑے یہودی فلسفی میمونائیڈز نے اپنی ...... "Commentary on the mishnah" میں یہودیت کے فلسفیانہ روایت کو مختصراً پیش کیا جس نے عقیدے کو تیرہ چیزوں میں محدود کر دیا۔ اسمیں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔ (۱) خالق کی موجودگی (۲) اس کی یگانگت (۳) اس کی بے جسمی (۴) اس کی ابدیت (۵) صرف اسی کی عبادت کرنا (۶) دیگر تمام نبیوں پر حضرت موسیٰ کی فوقیت (۷) نبیوں کے اقوال کی سچائی (۸) سینائی کے مقام پر موسوی شریعت کا انکشاف (۹) شریعت کی عدم تغیری (۱۰) خدا کی معرفت کل (۱۱) اس اور اگلی دنیا میں مکافات عمل (۱۲) مسیحا کی آمد اور (۱۳) مردے کا دوبارہ جی اٹھنا۔

یہودیت کے فرقے

موجودہ یہودیت تین شاخوں پر مشتمل ہے۔ آرتھوڈوکس، لبرل اور کنزرویٹو۔ امریکہ میں یہودی برادری کم وبیش برابر تقسیم ہے۔ دنیا کے دیگر حصوں میں آرتھوڈوکس تعداد زیادہ ہے۔ اور اسرائیل میں ان کا غلبہ ہے۔ زیادہ تر آرتھوڈوکس دوسرے دو فرقوں کی ''مذہبی چھوٹ'' پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس بات سے کوئی بھی فرقہ انکار نہیں کرتا کہ تینوں فرقے سچے طور پر یہودی ہیں۔

آرتھوڈوکس یہودیت میں قدیم اور صدہا سال میں بننے والی رسومات کی پابندیوں،

عبادتی قواعد الوہی قوانین سبت کے ضابطوں روزہ داری اور دیگر رواجوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ رسومات یں بہت کچھ تقاضا کرنے والی متعدد اور سخت ہیں۔ جن کا بنیادی تعلق عبادتی قواعد سے ہے۔ آرتھوڈوکس یہودیوں کی قدیم روایات عہد جدید میں آتے آتے بہت کم بدلی ہیں۔

لبرل یا ریفارم یہودیت کا آغاز ۱۹ویں صدی میں جرمنی سے ہوا اس نے یہاں سے امریکہ جا کر خودمختار جماعتیں قائم کیں۔ جدید سوچ رکھنے والے ربی اور دیگر رہنما اس کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ ریفارم تحریک کا اصل مقصد یہودیت میں سے وہ رواج خارج کرنا تھا جنہیں اس کے بانیوں نے دقیانوسی قرار دیا۔ اس کے علاوہ لبرل تحریک نے شریعت کے بارے میں بنیاد پرست نکتہ نظر اور دینیاتی گڑبڑاہٹ کو بھی خارج کرنا چاہا۔ ری فارم اور آرتھوڈوس فرقوں کے درمیان ایک فرقہ خود کو ''کنزرویٹو'' کہتا ہے۔

یہودیت کی تیسری شاخ کنزرویٹو کا احیاء ۱۸۴۵ء میں جرمنی سے ریفارم کے جواب میں ہوا۔ امریکہ کی یہودی دینیاتی درس گاہ امریکہ میں کنزرویٹزم کا مرکز ہے۔ اس کے بانیوں نے آرتھوڈوکسی کو غیر لچکدار اور ریفارم کو سب کچھ برداشت کرنے والی قرار دے کر تیسرا درمیانی راستہ اختیار کیا۔

یہودی مذہبی تجربہ

ساری تاریخ میں یہودی مذہبی تجربہ میں نجابت اور بدنصیبی کی خصوصیت (بالخصوص ۵۸۶ ق۔م میں یروشلم کے زوال کے بعد) موجود رہی ہے۔ یہودی فکر میں شامل مخصوص مذہبی نظریات نے بائبلی یہودیت کے روحانی وارثوں عیسائیوں اور مسلمانوں کو بہت عمیق طور پر متاثر کیا ہے۔ ان میں سب سے عظیم نظریہ صرف ایک ہی خدا کی عبادت کا ہے۔ یہودی وحدانیت مذہب فکر کی زبردست ترقی کا حامل قدم ہے۔ یہودیوں کے لیے قادر مطلق خدا شخصی تھا جو محبت کر سکتا اور کرتا ہے۔

ایک بہت بڑی شخصیت نے یہودیت اور جدید فلسفیانہ و سائنسی فکر کے درمیان نیا

تصفیہ پیدا کرنے کی راہ ہموار کی۔ موسیٰ نے لیبنیز کی مابعد الطبیعیات کے حوالے سے یہودیت کی تشریح کی۔ اس نے عقیدے کے بنیادی عناصر کو گھٹا کر تین اعتقادات تک کر دیا..... خدا پر یقین خدا کی مشیت پر یقین' اور روح کی لافانیت پر یقین۔ روشن خیالی کے نام سے جانی جانے والی تحریک' جس کی مرکزی شخصیت جرمن فلسفی کانٹ تھا نے مذہب اور فلسفے میں بیان کردہ منطقی تقاضوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی یہودی کوششوں کو مہمیز دی۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

۱۵ :: بدھ مت

"اپنا چراغ راہ خود بنو"۔

(گوتم بدھ)

گوتم بدھ ۵۶۷ ق۔م میں نیپال کے قصبے وستو کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں لمبنی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ شدھودھن شاکیہ قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی ماں مایا نے اسے جنم دینے کے سات دن بعد فوت ہوگئی۔ بدھ کا اصل نام سدھارتھ اور خاندانی نام گوتم تھا۔

بچپن سے ہی سدھارتھ خاموش طبیعت متفکر اور نیکی و پاکیزگی سے بھرپور تھا۔ اس کے باپ نے اس کی روحانی رغبتوں کو نوٹ کیا اور نوجوان شہزادے کو دنیا سے بے تعلقی اختیار کرنے کی بجائے پوری پوری کوشش کی۔ لڑکپن کے دوران بدھ نے حیرت انگیز دانش کا مظاہرہ کیا۔ وہ زندگی کے ازلی مسائل پر بہت دکھی ہوا دکھ بیماری' بڑھاپا' موت وغیرہ۔ شہزادے کی پرورش پر آسائش ماحول میں ہوئی تھی۔ اور مناسب عمر میں یشودھرا سے اس کی شادی ہوگئی۔ جس سے اس کا ایک بیٹا راہول پیدا ہوا۔ ۲۹ برس کی عمر میں وہ گھر اور سلطنت چھوڑ کر ایک مجرد بن باس کی راہ پر چل نکلا تاکہ دکھ کا راز اور علاج دریافت کر سکے۔

سب سے پہلے اس نے نہایت کٹھن ریاضتیں کر کے تلاش حق کرنے کی کوشش کی اور آخر کار سات سال بعد گیا کے مقام پر بصیرت حاصل کی۔ تب سے ہی اسے بدھ یا تتھا گت کہا جانے لگا یعنی ایسا شخص جس نے صداقت پا لی ہو۔

بدھ کا فلسفہ

گوتم بدھ نے منطقی مذہب' عملی اخلاقیات اور زندگی کے سادہ اصول پیش کیے۔ فلسفہ کے یہ تمام پہلو مخصوص خصوصیات کے حامل ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اخلاقی رویے

بدھ کے فلسفہ کی بنیاد مخصوص اخلاقی رویوں اور اصولوں پر ہے۔ اس نے روحانی ترقی کے لیے عقائد و مسالک کا ایک مجموعہ ہی نہیں بلکہ منطقی طریقہ کار پیش کیا۔ اس کی تعلیمات نہایت سادہ اور رافع ہیں۔ جو چار اعلیٰ اخلقی نیکیوں سچائیوں پر مشتمل ہیں...... دکھ' دکھ کی جڑ' دکھ کا خاتمہ' اور دکھ کے خاتمہ تک پہنچانے والی یہ راہ یہ حصول نروان کے معاون ہیں۔

(۲) چپ کی حالت

بدھ کا مذہب اور اخلاقیات خود انحصاری پر منحصر ہے۔ اس نے ہمیشہ ان مابعد الطبیعیاتی معاملات سے گریز کرنے کی کوشش کی جن کے لیے طویل بحث درکار ہوگی۔ بدھ کا مطمع نظر مسائل زندگی کا حل پیش کرنا تھا...... یعنی دک اور تکالیف' چاہے جسم روح سے مختلف ہے یا نہیں چاہیں روح فانی ہے یا لافانی' چاہے دینا محدود ہے یا لامحدود' چاہے آواگون ہوتا ہے یا نہیں اسے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ یہ فلسفیانہ سوالات ہیں جن کے بارے میں وہ خاموش رہا۔ دس سوالات خود توضیحی ہیں: آیا کائنات (۱) ازلی ہے (۲) غیر ازلی ہے (۳) محدود ہے یا (۴) لامحدود آیا جسم اور زندگی (۵) ایک ہی ہیں یا (۶) مختلف آیا کوئی تتھاگت موت کے بعد (۷) موجود ہوتا ہے یا (۸) نہیں ہوتا یا آیا (۹ اور ۱۰) وہ دونوں ہی موت کے بعد وجود رکھتے ہیں یا نہیں۔

(۳) یاسیت اور رجائیت

یاسیت فلسفہ بدھ کی ایک اور اہم خصوصیت ہے بدھ دنیا کو دکھ اور تکلیف سے بھرپور خیال کرتا ہے۔ اسنے کہا کہ پیدائش دکھ ہے بڑھاپا دکھ ہے اور موت بھی دکھ ہے۔ زندگی میں تکلیف اور دکھ ہی دکھ ہے۔ اس کا پہلا اعلیٰ ترین سچ یہ ہے کہ دکھ موجود ہ۔ تاہم ہر فرد کا فض ہے کہ وہ نروانب یا پر تکلیف دنیا کے دکھوں سے نجات حاصل کرے۔ تکالیف کا خاتمہ ہی بدھ مت کا مقصد ہے۔ بلاشبہ زندگی دکھوں سے پر ہے۔ لیکن ایک راہ نجات

موجود ہے۔ اس نے اپنے چوتھے سچ میں کہا کہ دکھوں سے نجات پانے کی ایک راہ (مارگ) موجود ہے۔ چنانچہ بدھ کا فلسفہ یاسیت پسندی سے شروع ہونے کے باوجود نہایت رجائیت پسندی پر منتج ہوتا ہے۔

(۴) حقیقت پسندی

بدھ نے ویدوں میں رسومات اور جانوروں کی قربانی (یگیہ) وغیرہ جیسے اندھے اعتقادات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ ویدوں کی حاکمیت بطور الہامی علم تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ وہ سند پر نہیں بلکہ استدلال پر انحصار کریں۔ اپنی تعلیمات میں اس نے زندگی کے حقیقی تجربے پر زور دیا۔ کسی شخص، یا زندہ ہستی انا یا زندہ وجود جیسی کوئی شے موجود نہیں کہ جسے لافانی یا پائیدار روح کہا جا سکے۔ آتما کا نظریہ محض رواجی ہے۔

(۵) ملحدیت

بدھ مت خدا کے بغیر مذہب ہے۔ خدا کا مقام دھرم کو دیا گیا ہے۔ دھرم ہی ساری دنیا کو چلاتا ہے۔ بالخصوص ہنایان بدھ مت میں دھرم ہی کی وجہ سے کرم کے نتائج اکٹھے ہوتے رہتے ہیں اور ہر شخص کو اپنے کرموں کی مطابقت میں ہی ذہن، جسم اور دنیاوی اشیاء ملتی ہیں۔ ہنایان ملحدانہ ہے۔ چونکہ بدھ مت ویدوں کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ اس لیے اس مفہوم میں بدھ مت ناستک ہے۔ ہنایان کتبہ میں بدھ کو کبھی بھی قابل پرستش یا خدا کے طور پر خیال نہیں کیا گیا۔ ناگ ارجن اپنی مدھیا میکا میں حقیقت مطلق سے انکار کرتا ہے اور اسے بطور شنیتا (Nothing-ness) بیان کرتا ہے۔

(۶) نتائجیت

بدھ کی تعلیمات بہت نتائجیتی (Pragmatic) اور عملی ہیں بدھ کا بتایا ہوا اعلیٰ ترین عملی اخلاقیات کا ضابطہ ہے۔ جس کا انداز منطقی ہے۔ اس کا قابل ذکر آٹھ نکاتی راستہ اشٹنگ مارگ نہایت نتائجی اور تجربی ہے۔ اس نے تمام مابعد الطبیعیاتی سوالات کو

استدلال اور تجربے کی مدد سے مسترد کیا ہے۔ اسے ثبوتیت اور مظہریت پسندی کا فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ بدھ کے مطابق تجربہ علم کا واحد ذریعہ ہے۔

چار اعلیٰ صداقتیں

(۱) دکھ موجود ہے: زندگی درد و اذیت سے بھری ہوئی ہے۔ پیدائش دکھ ہے' بڑھاپا دکھ ہے' بیماری دکھ ہے اور موت دکھ ہے۔ دکھ مسرت کا نتیجہ ہے۔ غربت حرص' خواہش' غصہ' نفرت اور جھگڑے انسانی دکھ کی وجوہات ہیں۔

(۲) دکھ کی ایک وجہ ہے: دوسری اعلیٰ صداقت کا تعلق دکھ کی وجوہات سے ہے۔ دکھ ایک حقیقت ہونے کی وجہ سے اس کی لازماً کوئی علت یا وجہ بھی ہوتی ہے۔ جنم مرن کے چکر کو قائم رکھنے والی قوت محرکہ یعنی خواہش دکھ کی بنیادی وجہ ہے۔ یہ خواہش تین قسم کی ہوتی ہے..... (۱) نفسانی مسرتوں کے لیے جنسی خواہش (۲) زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے زندگی کی خواہش اور (۳) دنیاوی ثروت کے لیے دولت کی خواہش۔ تمام دکھ لگاوٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو بذات خود لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔

علیت کا یہ سلسلہ آواگون (بھون چکر) کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان ۱۲ رابطوں کو تین مرحلوں یعنی ماضی' حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اسے سلسلہ وار پیش کیا جارہا ہے:

گزشتہ زندگی

۱۔ لاعلمی (اودیا)

۲۔ رغبت (سمسکار)

جاری زندگی

۳۔ شعور (وجنان)

۴۔ نام اور روپ

۵۔ چھ حیاتادراک (شیدایتن)

۶۔ چیزوں کا لمس (سپرش)

۷۔ حسی تجربہ (ویدنا)

۸۔ اشیاء کی خواہش (ترشنا)

۹۔ اشیاء سے لگاؤ (اپادنا)

۱۰۔ جنم لینے کی تمنا (بھو)

آئندہ زندگی

۱۱۔ پیدائش (جاتی)

۱۲۔ دکھ سہنا (جر مارن)

(۳) دکھوں کا خاتمہ: یہ اعلیٰ ترین صداقت دکھ کا نابود ہو جانا ہے۔ دکھ کی وجوہات کو دور اور ختم کر کے دکھ کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں برانگیختگی خواہش اور زندگی کی محبت مکمل ختم ہو جاتی ہے۔ جذبات کی تباہی اور نفسیاتی مسرت کا قلع قمع ہی نروان ہے۔ یہ کامل طمانیت ہے جس میں خواہشات اور پریشانیوں کا کوئی دخل نہیں۔

(۴) دکھ کے خاتمہ کا ایک راستہ ہے: بدھ کے مطابق چوتھی اعلیٰ ترین صداقت دکھ اور تکلیف ختم کرنے کا راستہ ہے۔ یہ راستہ (مارگ) آٹھ نکاتی ہے۔ نروان کا مطلب تکالیف کی معدومی اور کامل سکون قلب کا حصول ہے۔

آٹھ نکاتی راستہ

(۱) درست نظر

لاعلمی دکھ کی جڑ ہے۔درست نظر کی تعریف اشیاء کی حقیقی نوعیت کے متعلق درست علم کے طور پر کی گئی ہے۔لاعلمی دنیا اور روح کے درمیان تعلق کا غلط منظر پیدا کرتی ہے۔

(۲) درست ارادہ

دوسر کا مطلب صحیح عزم کرنا ہے۔دکھ کی محض جانکاری کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک کہ ہم ایک کامل روحانی زندگی گزارنے کا عزم نہ کرلیں۔ بری سوچ' نفسانی خواہشات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور ایک کامل زندگی گزارنے کا عزم صمیم ہی درست ارادہ ہے۔

(۳) درست گوئی

فضائل اخلاق کے لیے جدوجہد کرنے والے کے لیے اپنی گفتگو پر قابو پانا ضروری ہے۔درست گوئی کا مطلب دروغ گوئی سے گریز سخت اور تحقیر آمیز الفاظ نہ بولنا' فضول گفتگو اور تنقید سے اجتناب کرنا ہے۔ ہر شخص کو دکھ دینے والی بات سے گریز کرنا اور مناسب و درست الفاظ ہی بولنے چاہئیں۔

(۴) درست رویہ

درست رویے کا مطلب کسی کی زندگی کو نقصان پہنچانے چوری کرنے جنس پرستی' دھوکہ دہی اور بدکاری وغیرہ جیسی سرگرمیوں سے بچنا ہے۔بدھ نے بھکشوؤں والدین' بچوں' طالب علموں' اساتذہ' شوہر اور بیوی کے لیے طرز عمل کے مختلف ضوابط تجویز کیے ہیں۔اس نے ایثار' فیاضی اور سب کے ساتھ ہمدردی کا سبق پڑھایا۔

(۵) درست کمائی

اس کے مطابق ہمیں اپنی روزی روٹی ایماندار اور جائز ذرائع سے کمانی چاہیے۔

اس کے بغیر درست رویہ پوری طرح سے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بدھ کے مطابق ہتھیاروں‘ جانوروں‘ گوشت اور شراب وغیرہ کا کاروبار نہیں کرنا چاہیے۔ دھوکہ دہی اور برے ذرائع مثلاً رشوت بدعنوانی اور ڈاکہ زنی سے کمائی ہوئی دولت سے ہرگز فائدہ نہیں ہوتا۔

(۶) درست کوشش کریں

اخلاقیات کی راہ پر چلنے والے کے لیے لازمی ہے۔ کہ وہ برے احساسات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور اپنے ذہن میں برے خیالات نہ آنے دے۔ اس میں برے خیالات کے خلاف اور نیک خیالات بیدار کرنے کے لیے خود ضبطی اور مسلسل کوشش شامل ہے۔

برے خیالات سے بچنے کے طریقے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کسی اچھے خیال پر سوچوں کو مرکوز کرنا۔

(۲) بری سوچ پر عمل کے نتائج کا تجزیہ کرنا۔

(۳) بری سوچ کی علت کا تجزیہ کرنا اور اس کے نتائج کو روکنا۔

(۴) جسمانی کوششوں کے ذریعہ ذہن کو قابو میں رکھنا۔

(۵) دھرم کی پابندی کرنا۔

(۷) درست تفکر

اس کا مطلب جسم ضمیر اور ذہن کو ان کی حقیقی حالت میں مستحکم رکھنا ہے۔ برے خیالات صرف تبھی ذہن پر غلبہ پاتے ہیں جب ان کی حقیقی حالت کو بھلا دیا جائے درست تفکر میں جسم کی ناپاکیوں‘ مسرت‘ دکھ اور ذہنی و جسمانی تکالیف وغیرہ کی یاد دہانی کرتے رہنا شامل ہے۔ بدھ نے تعلیم دی ہے کہ جسم مٹی‘ پانی‘ آگ اور ہوا سے مل کر بنا ہے۔ ہمارے جسم کا شعور اور اپنے یا کسی اور جسم کے ساتھ لگاوٹ ہمیں اس قسم کی غیر ضروری تمنا اور رغبت سے بچنے میں مدد دیتی ہے۔

(۸) درست مراقبہ

ان سات اخلاقی طرزِ عمل کو اپنانے اور ان کا تجربہ کرنے والا شخص مراقبہ کی راہ پر قدم رکھنے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں فضائل اخلاق کا متمنی اپنے پاکیزہ ذہن کو سچائی اور استدلال پر مرکوز کرتا ہے۔ مراقبے کی مندرجہ ذیل منازل ہیں:

(۱) پہلی منزل میں چار اعلیٰ صداقتوں پر پرسکون ذہن کے ساتھ غور و فکر کیا جاتا ہے۔

(۲) وجدان سوچ کی جگہ لے لیتا ہے۔ غور و فکر فالتو اور استدلال غیر ضروری بن جاتا ہے۔

(۳) لاتعلقی اور توازن کی حالت۔

(۴) غم نہ خوشی کی حالت: کامل طمانیت یا زروان کا حصول۔

بدھسٹ قانون کے ساتھ موتی

۱۔ چار پرخلوص ریاضتیں۔ یعنی جسم، حسیت، خیالات اور منطق کی ریاضت۔

۲۔ گناہ یا بدی کے خلاف زبردست چار نکاتی جدوجہد، یعنی گناہگاری کو ختم کرنے کی جدوجہد، پیدا ہونے والی گناہگار حالتوں پر قابو پانے کی جدوجہد اچھا بننے کی جدوجہد اور اچھائی کو بڑھانے کی جدوجہد۔

۳۔ ولایت کے چار راستے، یعنی چار ذرائع: ارادہ کوشش، تیاری، اور تحقیق جس کے ذریعہ سدھی یا اولیائی مافوق الفطرت قوتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

۴۔ پانچ اخلاقی قوتیں۔

۵۔ روحانی دانش کی پانچ حسیں، یعنی یقین، سوچ، استغراق اور دانش۔

۶۔ سات قسم کی دانش: توانائی، سوچ، استغراق تحقیق، مسرت، خاموشی اور طمانیت

۷۔ اعلیٰ آٹھ نکاتی راستہ۔

بدھ کے پانچ فرمان (پنچ شیل)

۱۔ کسی زندہ شے کو مت مارو۔

۲۔ جو تمہیں نہیں دیا گیا اسے مت لو۔

۳۔ جھوٹ مت بولو۔

۴۔ نشہ آور مشروبات مت پیو۔

۵۔ بدکاری نہ کرو۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بدھ کے مذہبی مکاتب

ہنایان اور مہایان

بدھ کی وفات کے ایک سو سال بعد بدھسٹ جماعت (سنگھ) وسیع پیانے پر مکاتب میں تقسیم ہوگئی۔ ہنایان اور مہایان۔ مہا (اعلیٰ یا عظیم) یان (سواری) بنیادی طور پر ہی ہنا (کمتر یا پست) یان (سواری) سے اپنی اخلاقیات' عقائد' خانقاہی زندگی اور تصور بدھ میں اختلاف رکھتا ہے۔

ہنایانی حقیقی پرانے بدھ مت کے پیروکار ہیں جو اپنی نوعیت میں بنیاد پرستانہ ہے۔ ہنایان ایسا مذہب ہے جو خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ یہ ملحدانہ ہے۔ ہنایان میں سنگھ موجود ہے۔ دھرم کو خدا کی حیثیت دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ مسلک میں خدا سے منکر ہے تاہم عملی طور پر بدھ کی عبادت کی اجازت دیتا ہے۔ کوئی ایسی بھگتی موجود نہیں جو کسی زندہ خدا پر دلالت کرتی ہو۔

ہنایان فرقہ ''ارہت'' کی حالت کو اعلیٰ ترین منزل سمجھتا ہے۔ کامل علم یا خود افروزی اسی حالت میں ممکن ہے۔ یہ خود انحصاری پر زیادہ زور دیتا ہے۔ تاہم روح کے عدم تشدد کو قبول کرتا ہے۔ ہنایان کے لیے تمام اشیاء عارضی ہیں۔ ہنایان بدھ مت نروان کا متلاشی ہے۔ جس کا انحصار خدا کی رحمت پر نہیں۔ یہ قانون کرم اور نظریہ تناسخ کو قبول کرتا ہے۔ یہ اپنے طریقہ کار میں کٹر اور سلبی ہے ہنایان کا مذہب اور فلسفہ مقبول عام نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ہمیں زندہ رہنے کے لیے کوئی راحت بخش عقیدہ دیتا ہے۔ اور نہ ہی عمل کرنے کے لیے کوئی حقیقی تصور۔

مہایان مکتبہ ترقی پسند اور سادہ ہے۔ یہ ہمیں خدا' روح اور انسانی مقدر کے مثبت تصورات فراہم کرتا ہے۔ مہایان فرقے کے متلاشی حق ''بودھستو'' کی حالت پانے کی جستجو کرتے ہیں۔ مہایان میں بدھ قابل پرستش بن گیا ہے اور مطلق وجود سے مشابہہ

قرار دیا جانے لگا ہے۔ مہایان فرقے کے لیے بدھ کی شفقت اور رحمت انسان کی عالمگیر نجات تک بھی لے جاسکتی ہے۔ مہایان ایک ماورائی حقیقت پر یقین رکھتا ہے' اور بدھ اس ماورائی حقیقت سے مشابہہ ہے۔ یہ دنیا کی مطلق حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ دنیا مظہراتی ہے اور مطلق طور پر حقیقی ہے۔

فلسفیانہ اعتبار سے مہایان مکتبہ مزدی دو دھڑوں میں بٹ گیا تھا: شنیہ وادیا مدھیا مک اور وجنان وادیا یوگا چار۔ ہنایان مکتبہ بھی دو فلسفیانہ دھڑوں میں تقسیم تھا یعنی وبھاشک اور سوتر اشک۔

(۱) شنیہ وادیا مدھیا مک

مدھیا مک مکتبہ ''شنیہ وادیا'' یا عالم گیر لاشئیت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ خارجی دنیا کے مطلق وجود اور ادراک سے انکار کرتا ہے ناگ ارجن کے مطابق حقیقت مطلق ہست ہے نہ عدم دونوں ہی نہ ہست ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے مختلف۔ اس کے پیروکار مدھیا مک کہلاتے ہیں۔

(۲) یوگا چار یا وجنان واد

یوگا چار مکتبہ نے اپنے گرو کی تعلیمات کو قبول کیا اور معرفت وخیالات کی بطور حقیقی ذہنی مظہر وجود تلاش کے لیے عملی یوگا کو اپنایا۔ اسے بطور جنان واد جانا جاتا ہے۔ یونکہ اس کے مطابق تمام اشیا باشعور ہیں۔ یہ مکتبہ روح کو تمام زندہ ہستیوں پر محیط خیال کرتا ہے۔

(۳) وبھاشک

وبھاشک خارجی دنیا اور ذہنی مظہر کی حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے مطابق نظریہ ''شیہ'' وبھاش یا وردھ بھاش ہے (وردھ = مخالف اور بھاش = بولی) انھیں پرتیکشا وادی یا حقیقت پسند خیال کیا جاتا ہے۔ یہ مکتبہ روح اور مادہ دونوں کو مانتا ہے یہ دونوں دھرموں سے مل کر بنے ہیں۔

(۴) سوتر اشک

اس مکتبہ نے معرفت کو تسلیم کیا اور کہا کہ اگر چہ خارجی دنیا کا ادراک نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسرے لوگوں کی شہادت سے خارجی دنیا کو مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ سوتر اشک کو شنیتا یا سوتر کا اختتام کہا جاتا ہے۔ اس مکتبہ کے مطابق دو اشیاء میں کوئی علیت نہیں۔ اور نہ ہی حال کے علاوہ کوئی ماضی یا مستقبل ہے۔ سوتر اشکوں کا عقیدہ ہے کہ علم خود آشا کر ہے اور اسے ثابت کرنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک چراغ کے مانند خود افروز اور خود درخشاں ہے۔

نروان

لفظ ''نروان'' کا مطلب بجھ جانا یا خواہشات یا تمناؤں (ترشنا) کا معدوم ہو جانا ہے۔ یہ محض معدومیت ہی نہیں بلکہ کسی شخص کی حالت طمانیت بھی ہے۔ نروان کی حالت میں خواہش اور جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور نجات یافتہ شخص ادھر ادھر جانے کی بجائے قطعی سکون حاصل کر لیتا ہے۔ نروان ایجابی لطف کے ساتھ عینیت رکھتا ہے۔ یہ پاکیزہ طمانیت اور حقیقی علم دیتا ہے۔

تسخیر ذات کر لینے والا شخص شہوت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ مزید کوئی تمنا نہیں کرتا۔ شعلہ خواہش کو جلتے رہنے کے لیے مزید کوئی مواد نہیں مل پاتا۔ خواہش اور شہوت کا یہ شعلہ بجھ جانے پر حالت عرفان حاصل ہوتی ہے۔ حالت عرفان میں کوئی لاعلمی، دکھ تکلیف، بیماری اور موت موجود نہیں ہوتی۔

جب ایک شاگرد نے پوچھا کہ نروان ایجابی حالت ہے یا سلبی تو بدھ نے کہا: ''اے بھکشو! یہ ایسی حالت ہوتی ہے جس میں مٹی ہوتی ہے نہ پانی روشنی نہ ہوا، لامحدودیت نہ محدودیت، نہ استدلال کی لامحدودیت، نہ لاشے ادراک نہ عدم ادراک یہ دنیا نہ وہ دنیا، سورج اور نہ ہی چاند ہوتا ہے۔ اے بھکشو! میں اسے موت اور نہ ہی پیدائش آن اور نہ ہی جانا کہتا ہوں۔ یہ اساس، ملکیت، تدارک سے عاری ہے۔ یہ دکھ کا اختتام ہے...... یہ

نروان ہے''۔

بدھ کا تصور نروان سمجھنا مشکل ہے۔ اس کے کچھ پیروکاروں نے خیال کیا کہ یہ قطعی استرداد کی حالت ہے' دیگر کا یقین ہے کہ یہ کائنات موجود ہر چیز کی مکمل نیستی ہے۔ ان میں سے کچھ نے سمجھا کہ کامل کالعدم پذیر حالت ہے' دیگر کا خیال تھا کہ یہ قطعی عدم وجود یا فنائے ذات ہے۔

بدھسٹ فلسفہ کے چار مکاتب بنے۔ پہلا نہایت فنائیت یا معدومیت پسند (منکر کل) تھا اس نے نروان کی تشریح دنیا کے قطعی خالی پن کے ادراک اور مسعود لاشیئیت اور معدومیت کے طور پر کی۔ اس حالت کو زندگی کا اعلیٰ ترین اور حتمی مقصد خیال کیا گیا۔ دیگر تین مکاتب کو یقین تھا کہ بدھ کی مراد فنائے ذات و کائنات اور اپنے آپ میں مجرد سوچ کی مستقل دائمیت سے تھی۔

نظریہ لا روح

بدھ کے مطابق تبدیلی حقیقت ہے۔ یہ اشارہ دیتی ہے کہ جو کچھ بھی حقیقی ہے وہ دائمی نہیں۔ کچھ بھی دائمی نہیں ہے۔ قانون تغیر ہمہ گیر ہے۔ چنانچہ بدھ کسی دائمی روح پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ روح یا نفس کے وجود سے انکار کرتا ہے جسے ذہن کہتے ہیں۔ وہ تصورات وخیالات کا بہاؤ ہے۔ سوچیں' احساسات' خواہش وغیرہ ایک لمحے کی پیداوار ہیں۔ ہمارا ذہنی عمل شعور کے ایک بہاؤ جیسا ہے۔ اس بہاؤ سے ماورا کوئی دائمی روح موجود نہیں۔ روح ادراکات کا بہاؤ ہے۔ اس بہاؤ سے ماورا کوئی دائمی روح موجود نہیں۔ روح ادراکات کا بہاؤ ہے۔ لہٰذا بدھ نے لا روح کے نظریہ پر زور دیا۔

نظریہ لا روح سے مراد دو باتیں ہیں (۱) روح یا ذات غیر مستقل ذہنی و جسمانی عوامل کا مجموعہ ہے اور (۲) دنیا جوہر سے تہی ہے۔ یہ غیر پائیدار خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ بدھ کہتا ہے کہ اگر چہ کوئی پائیدار جوہر موجود نہیں' یہ غیر پائیدار خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ بدھ کہتا ہے کہ اگر چہ کوئی پائیدار جوہر موجود نہیں لیکن بتدریج حالتوں کا ایک تسلسل

موجود ہے جو ہماری زندگی کو متشکل کرتا ہے۔ لاروح کا نظریہ منحصر اصلیت کے عقیدے کی پیروی میں ہے۔ شعور کے بہاؤ کے علاوہ کوئی نظر نہ آنے والا پائیدار جوہر موجود نہیں شعور میں جاری لمحہ ماضی کے لمحہ کا نتیجہ ہے اور آئندہ لمحہ جاری رہے گا۔

بدھ نے زندگی کے تسلسل کی وضاحت راغ کی لوگ کی مثال کے ساتھ کی۔ لو ہر لمحے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بدھ دوبارہ جنم اور قانون کرم پر یقین رکھتا ہے۔ تاہم وہ اس مفہوم میں آواگون کا ماننے والا نہیں کہ روح ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے وہ جنم مختلف ہوتے ہیں۔

بدھ کے مطابق موجود نہ رہنے والی روح سے غیر ضروری لگاؤ دکھ کی وجہ ہے۔ وہ کہتا ہیکہ تمام تکالیف کی جڑ ''میں'' کے احساس میں ہے۔ تصور ملکیت اور میرا اور تمہارا احساس روح کے غلط تصور کی وجہ سے ہے۔ روح کا ادراک اور نظارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسکا کوئی وجود نہیں۔ اس نے اپنے شاگردوں سے کہا روح کے متعلق فضول بحث میں نہ الجھیں۔ روح ہمارے تجربہ اور استدلال سے ماورا ہے۔

بدھ نے وضاحت کی کہ انسان پانچ خصوصیات کے مجموعے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا' جو یہ ہیں: روپ' احساس (ویدنا)' ادراک (منجم)' رغبت (سمسکار) اور شعور و آگہی (وجنان) چنانچہ بدھ کے مطابق ذات طبیعیاتی پیچیدگیوں کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں۔ ویدانت فلسفہ اسے تسلیم نہیں کرتا۔

بدھ مت کے صحائف

''پٹک'' کے طور پر مشہور بدھسٹ صحائف تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں یعنی (۱) ستہ پٹک (انکشافات کی کتاب) (۲) ونیہ پٹک (تربیت کی کتاب (۳) ابھیدم پٹک (فلسفہ کی کتاب)۔ پٹک کا لفظی مطلب ٹوکری یا پٹاری ہے۔ بدھ کے اقوال اور تعلیمات کو تحریر کرنے کے بعد مختلف ٹوکریوں میں رکھا جاتا تھا غالباً یہیں سے ان کا نام پٹک پڑ گیا۔

ستیہ پت بدھ کے مذہبی انکشافات اور اقوال کے پانچ مجموعوں پر مشتمل ہیں اور اس یے صحائف کا اہم ترین جزو ہیں۔ونیہ پٹک میں خانقاہی تربیت کے ضوابط جبکہ ابھید ھم پٹک میں بدھ کی تعلیمات کے فلسفیانہ اور اخلاقی پہلو شامل ہیں۔تینوں کا مجموعہ ''تری پٹک'' کہلاتا ہے۔بدھ مت کے ہر طبقے کا اپنا اپنا تری پٹک مجموعہ ہے۔ان کے علاوہ جاتکوں میں ادب اور بدھ کی کہانی شامل ہے۔

بدھم' دھرم اور سنگھ

بدھ مت میں تین چیزیں اہم ہیں: بدھ جو دنیا کا آقا اسے بچانے اور دوبارہ وجود میں لانے والا ہے۔دھرم بدھ کے مذہب کی شریعت ہے۔جو ابدی ہے۔اور یہ دنیا دھرم یا راست بازی کے قوانین کی ہی پیروی کرتی ہے۔سنگھ یا جماعت بدھسٹ برادری کی تنظیم ہے۔یہ تینوں ''تثلیث'' کہلاتے ہیں۔ہر بدھسٹ چاہے ایک بھکشو بھکشنی یا گرہست' کے لیے ضروری ہے کہ صبح' دوپہر اور شام کے وقت اس بارحمت تثلیث کو سلام اور اس پر غوروفکر کرنے کے علاوہ یہ منتر دوہراتا رہے:

بدھم شرنم گچھامی (بدھ میں پناہ مانگتا ہوں)۔

دھمم شرنم گچھامی (دھرم میں پناہ مانگتا ہوں)۔

سنگھم شرنم گچھامی (سنگھ میں پناہ مانگتا ہوں)۔

بدھ مت بطور مذہب

یہ درست ہے کہ بدھ نے خدا کی تبلیغ اور نہ ہی روح کی نوعیت پر بحث کی ہے۔وہ افلاک پر بھی توجہ نہیں دیتا۔تاہم اس کا مذہب خالصتاً انسانیت پسندی کا مذہب تھا۔جس کی بنیاد اخلاقی قوانین پر ہے۔اگرچہ یہ تسخیر ذات اور راستی پر راست بازی کی فتح کا مذہب تھا لیکن پھر بھی خدا کی زندہ تجسیم ہے۔لوگوں نے اس کے سامنے ماتھا ٹیکا' اس کی عبادت کی' اور تعظیم کے ساتھ اس کے نام کا ورد کیا۔اس سے مدد مانگی۔اور اس کی وفات کے پچاس سال بعد تک اسے کائنات کے آقا اور محافظ انسانیت کے طور پر پوجا۔

بدھ نے اپنے شاگردوں کو آخری الفاظ یہ کہے: ''اپنا چراغ راہ خود بنو اپنی پناہ گاہ خود بنو۔ کسی اور میں پناہ مت ڈھونڈو۔ صداقت کو ایک چراغ کی طرح مضبوطی سے تھامے رکھو۔ صداقت کو ایک پناہ گاہ کی طرح اپنے ساتھ رکھو اور اپنی نجات خود تلاش کرو۔''

بدھ مت شمالی ہندوستان میں ایک چھوٹی سی تحریک کے طور پر شروع ہوا تھا۔ لیکن شہنشاہ اشوک کی تخت نشینی تک یہ مذہب زیادہ تر شمالی وسطی ہندوستان میں پھیل گیا۔ بدھ مت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ رہا بلکہ سری لنکا تبت' شام' مصر اور وسطی و مشرقی ایشیاء تک سرایت کر گیا۔ بعد ازاں یہ مذہب چین جاپان' کوریا' برما اور دنیا ک دیگر مغربی ممالک میں متعارف ہوا۔ بدھ مت لوگوں میں بہت زیادہ مقبول ہوا جس کی وجہ بدھ کی تعلیمات کی سادگی برابری کا آزادانہ جذبہ بدھ کی جلال اور معجزاتی خصوصیات شاہی سرپرستی اور سنگھوں کی تبلیغی سرگرمیاں تھیں۔

بعد میں بدھ مت میں مختلف دھڑے بندیوں' سنگھ کی بدنظمی' راجپوتوں کے عروج اور ہندوؤں کی طاقت وری اور یکے بعد دیگرے بیرونی و مسلم حملوں کی وجہ سے اس مذہب میں زوال کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بدھسٹ دور بالخصوص ہندوستان میں عہد زریں تھا۔ کیونکہ اس دور میں فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ مشاغل و مذہبی تبلیغی تب پر شاندار کامیابی کے ساتھ کام ہوا۔

نتیجہ بحث

بدھ بنیادی اعتبار سے ایک اخلاقی گرو تھا۔ نہ کہ کوئی ماہر مابعد الطبیعیات یا فلسفی۔ اس کے خیال میں سب سے اہم کام انسان کو تکلیف اور بیماری سے باہر نکالنا ہے بدھ کی تعلیمات میں دنیاوی بندھن توڑنے اور تمام جذبات سے آزادی کے ذریعہ ضبط اور نیک چلنی کے عملی معاملات پر خصوصی زور دیا گیا ہے بدھ کے مطابق لاعلمی دکھ کی جڑ ہے' اور صرف لاعلمی کو دور کر کے ہی دکھ دور کیا جا سکتا ہے۔ ''درست نکتہ نظر'' یا آٹھ نکاتی راستہ بدھ کی تعلیم ہے جس پر عمل کر کے ہم لاعلمی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہمہ گیر تبدیلی اور تغیر پذیری کا عقیدہ نظریہ آزاد ابتدا کی بنیادی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے۔ کہ بدھ نظریہ آزاد ابتدا کو بطور درمیانی راہ منظور کرتا ہے۔ بدھ کی تعلیمات کا مقصد برائی سے بچنا اور پاکیزگی ذہن کے لیے نیکی کرنا ہے۔ اس نے ذہن کی متوان کیفیت حاصل کرنے کی خاطر راستباز زندگی گزارنے پر زور دیا ہے۔ اپنے آٹھ نکاتی راستے کو اس نے ''درمیانی راہ'' کہا کیونکہ یہ دنیا کے مکمل تیاگ اور مکمل قبولیت کی دو انتہاؤں سے گریز کرنے کی راہ ہے۔ وہ نظریہ کرم اور نظریہ آواگون پر یقین رکھتا تھا۔

بدھ کا فلسفہ تین الفاظ میں مختصراً بیان یا جا سکتا ہے......لاروح' فنا پذیری اور دکھ۔ پائیدار روح قرار دی جاسکنے والی کوئی شے موجود نہیں ۔نظریہ آتما محض ایک روایت ہے۔ نروان کے علاوہ سب کچھ فنا پذیر ہے اور نتیجۃً دکھ ہے۔ جسے ہم روایتی طور پر ایک شخص یا فرد کہتے ہیں وہ محض نام اور روپ پر مشتمل ہے۔ اور یہ دونوں ہر لحہ تغیر پذیر ہیں۔

ایجابیت 'مظہریت اور تجربیت کے بیج بدھ کے فلسفہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کو ایجابیت کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق ہمیں اسی دنیا میں زندگی کی بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اسے اس وجہ سے مظہریت اور تجربیت کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا تعلق علم اور ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔

☆☆☆

۱۶ :: سکھ مت

"خدا صرف ایک ہے' اس کا نام ابدی صداقت ہے"۔

(گرونانک)

سکھ مت عملی اعتبار سے شمال مغربی ہندوستان کے خطے پنجاب تک ہی محدود ہے۔ مذہب کے بانی نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء) نے اپنے لڑکپن سے ہی ہندومت اور اسلام دونوں کا مطالعہ کیا۔ لہذا سکھ مت بنیادی طور پر ان دونوں کا ملغوبہ ہے۔

گرونانک کی پیدائش ۱۴۶۹ء میں تلونڈی کے مقام پر ہوئی ان کا والد کا نام کالو تھا جو ایک ہندو تھے۔ والدہ کا نام ترپتا تھا۔ نانک دنیاوی معاملات سے بے نیاز تھے۔ ان کے پاس کچھ وجدانی علم تھا اور لڑکپن ہی سے انہوں نے کچھ بھجن لکھ ڈالے۔ پوری یک روی کے ساتھ انہوں نے خود کو خدا کی تعریف میں لگا دیا۔

ایک دن نانک اپنے گھر سے نکلے اور خدا کی تلاش میں بن باس لے لیا۔ جنگل میں کسی نے ان سے کہا "میں تمہارے ساتھ ہوں میں نے تمہیں مسرت دی ہے' اور ان سب کو بھی جو میرا نام لیں گے"۔ اس منظر کے بعد نانک نے مذہبی لباس پہنا اور مذہبی لوگوں کے پاس بار بار گئے۔ انہوں نے تمام حصوں میں سفر کیا اور تبلیغ شروع کر دی۔ پیروکاروں نے نانک کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ انہیں "گرو" سمجھا جاتا تھا۔ گرونانک کی وفات کے بعد گرو انگد' گرو امرداس' گرو رام داس' گرو ارجن' گرو ہرگوبند' گرو ہررائے' گرو ہرکرشن' گرو تیغ بہادر اور سب سے آخر میں گرو گوبند سنگھ آئے۔ یہ سکھوں کے دس گرو ہیں۔ سکھ کا مطلب "شش" یا شاگرد ہے۔

سکھ مت کا فلسفہ

(۱) خدا

سکھ مت بالاصل کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ ہندومت اور اسلام کا مرکب ہے۔ اسلامی وحدانیت اور بت شکنی اور ہندومت کے تصور برہما بطور ست چت۔ آنند کے عناصر سکھ مت کے دو ماخذ ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور انسانی بھائی چارہ سکھ مت کے انتہائی بنیادی عقائد ہیں۔ خدا اور گرو یعنی مذہبی رہنما سے محبت سکھ مت کی انتہائی اساس ہے۔ ہندومت کی طرح سکھ مت میں بھی تصور خدا یہ ہے کہ وہ یکتا و لاشریک ہے۔ خدا کو شخصی اور مطلق دونوں پر بیان کیا گیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے اور عالم مطلق ہے۔ اس کی کوئی تجسیم نہیں۔ وہ ہر شے میں موجود ہے۔ وہ ہر دل میں مکین ہے۔ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی ہستی ہے۔ جس کا نفس تمام انسانوں کے دلوں میں ہے۔ وہ خیال سے ماورا اور نا قابل تعین ہے۔ کوئی بھی اس کی عظمت اور اس کے افعال بیان نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے ہی آپ وجود رکھتا ہے۔ اس کا ارادہ عظیم ہے اور کچھ بھی اس کے ارادے سے باہر نہیں۔ اگرچہ سکھ شخصی خدا پر یقین رکھتے ہیں لیکن گرونانک نے اسے ''نرنکار'' یعنی بے صورت کہا۔

(۲) پانچ کاف

سکھ مت مذہبی تجربے اور سماجی حالات دونوں کی پیداوار تھا۔ کسی سکھ کو ''پاہل'' (بپتسمہ) لینے کے بعد برادری میں شامل کیا جاتا ہے۔ پاہل لینے کے دوران وہ پانچ کاف اپناتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں کیس، کچھا، کڑا، کرپان اور کنگھا (غیر تراشیدہ بال، جانگیہ، لوہے کا کڑا، چونچ سے خم کھایا ہوا خنجر اور کنگھی)۔ ان پانچ کاف کو استعمال کرنے والا خالصہ کہلاتا ہے۔ گرو گوبند سنگھ خالصہ کے خالق تھے اور ہر خالصے کا لقب سنگھ ہے۔ شکتی اور بھگتی کے رہنما خالصہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ (پانچ کاف کے حوالے سے یہ روایت بتائی جاتی ہے کہ مغل راج کے خلاف جدوجہد میں جب سکھوں کو بہت زیادہ مارا

گیا اور انہیں شاہی فوجوں کے خوف سے جنگل جنگل بیلے بیلے جان بچانے اور فوجوں پر حملہ کرنے کے لیے بھاگنا پڑا تو آخری گرو گوبند سنگھ نے پانچ کاف ہر ''سنگھ'' کے لیے ضروری قرار دیے۔ سنگھ ببر شیر کو کہتے ہیں اس لیے اس کے بالوں کی طرح سکھ کے بال بھی لمبے رکھنا ضروری ٹھہرا۔ چانگیہ کسی بھی وقت سوتے یا نہاتے ہوئے فرار ہونے کرپان دشمن کا مقابلہ کرنے اور کنگھی بالوں کو سنوارنے کے لیے ضروری تھی' جبکہ کڑا گرو کی غلامی کا نشان تھا۔ مغل فوجوں کے ساتھ لڑائی سے پہلے تک سکھوں میں باقاعدہ بادشاہانہ انداز کی تنظیم اور حاکمیت نہیں تھی لیکن بعد میں پیدا ہوگئی۔ مترجم)۔

(۳) سیوا

بھائی بندوں کی خدمت سکھ کا بنیادی فرض ہے۔ یہ محبت کا عملی اظہار ہے۔ گوردوارے محبت اور بھگتی کے ساتھ سیوا کا موقع فراہم کرتے ہیں لنگر میں اعلیٰ یا پست' امیر یا غریب' عالم یا جاہل ہندو یا مسلم تمام لوگ ایک ساتھ خدمت کرتے اور کھاتے تھے۔

(۴) گرو

گرونانک کے مطابق کوئی بھی شخص گرو یعنی استاد کامل کے بغیر خدا کو نہیں پا سکتا۔ گو اس کے دل سے غرور اور دنیاوی محبت نکالتا اور اعلیٰ ترین صداقت سے روشناس کرواتا ہے۔ ''سچا گرو'' علم کی تلوار کا مالک ہوتا ہے اور دل کے ساتھ لڑتا ہے۔ وہ دس اعضاء کے فعل اور فعل کا راز اور تمام بے جذبات کو جانتا ہے۔ وہ الوہی علم میں کامل اور غرور و خود فریبی سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا دل دنیاوی خواہشات سے پاک ہوتا ہے۔ وہ نفس کش ہوتا ہے بہت کم سوتا ہے اور بہت کم کھاتا ہے۔ وہ اپنے متبرک جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ بھگتی اور ریاضت میں مستحکم ہوتا ہے۔ وہ دن رات الوہی علم بتاتا ہے۔ وہ غرق خدا ہو کر بیدار ہوتا ہے۔

(۵) انداز عبادت

سکھوں کا واحد انداز عبادت میں یہ ہے کہ وہ اپنے گروؤں کے بنائے ہوئے بھجن پڑھتے اور سریلے انداز میں گاتے ہیں۔ سکھوں کا عقیدہ ہے کہ گرو کی روح ہمیشہ ان کے ساتھ ہے۔ وہ مقدس گرنتھ صاحب کی عبادت کرتے ہیں۔ گرونانک کے مطابق خدا کے نام کا مسلسل ورد خدا کو پانے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس لیے ریاضت انسان کی اعلیٰ ترین داخلی بصیرت بھی ہے۔ آقا کے نام میں اعلیٰ ترین روحانی اصول کی تخلیقی شکتی بھی مجسم ہے۔ جو کائنات کو قائم رکھتی ہے۔ گرو پر مکمل یقین اور اس کی بھگتی ہمیں حصول خدا میں مدد دیتی ہے۔ انسان کا اعلیٰ ترین مقصد وصال خدا ہے۔

(۶) اخلاقی قدر

مذہب کی ایک صورت کے طور پر سکھ مت مخصوص اخلاقی اقدار رکھتا ہے۔ گرونانک نے حصول خدا کے لیے دل و دماغ کی پاکیزگی پر زور دیا ہے۔ انہوں نے ذہن کی پاکیزگی کا تعلق جسم کی صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ جوڑا ہے۔ ہر فرد کو روحانی زندگی گزارنی چاہیے۔ انسان کو نیک بننا تمام برائیوں سے بچنا چاہیے۔ گرونانک نے ذات پات اور ختنہ کی رسم پر تنقید کی۔ اس کے علاوہ صنم پرستی اور روایات پرستی کو بھی برا جانا۔ اس کے ساتھ وہ دوبارہ جنم اور سچائی کے ہندو عقائد ربھی یقین رکھتے تھے۔ ہر فرد کا مطمع نظر اخلاقی و روحانی زندگی گزارنے کے لیے کاملیت حاصل کرنا ہے۔ سکھ مت ہمیں اچھے اور نیک اعمال کی تعلیم دیتا ہے۔

دوسرے مذاہب کی طرح سکھ مت میں بھی کچھ فرقے موجود ہین۔ عام طور پر سکھوں کے مندرجہ ذیل فرقے بتائے جاتے ہیں (۱) نانک پنتھی یا سہج دھاری اور (۲) خالصہ یا کیسا دھاری۔

سکھ مت کے صحائف

سکھ مذہب کے صحائف ’’گرنتھ‘‘ تعداد میں دو ہیں۔ ایک پانچویں گرو ارجن دیو نے

مرتب کیا اور دوسرا گرو گوبند نے۔ گرنتھ کو بالعموم آدی گرنتھ کہتے ہیں۔ یہ پہلے پانچ گروؤں کے بھجنوں پر مشتمل ہے ان سب کا ایک ہی مجموعہ گرنتھ صاحب کہلاتا ہے۔ گرونانک کی تعلیمات آدی گرنتھ میں شامل ہیں۔ جپ جی صحب کی دعاؤں پر مشتمل ہے۔ یہ گرونانک کے مرتب کردہ بھجنوں کا مجموعہ ہے۔ گرنتھ صاحب کا آغاز جپ جی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ حصول خدا کی راہ دکھاتا ہے۔ گرنتھ صاحب کا آغاز جپ جی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ حصول خدا کی راہ دکھاتا ہے۔ جپ جی صاحب میں گرونانک نے پانچ مرحلے دیے ہیں جن میں سے گزرنا انفرادی روح کے لیے ضروری ہے۔ تا کہ ابدی مسرت وطمانیت حاصل کر سکے۔ وہ مراحل یہ ہیں۔ (۱) دھرم کھنڈ (۲) گیان کھنڈ (۳) شرن کھنڈ (۴) کرم کھنڈ اور (۵) سچ کھنڈ۔

سکھ مت کی تعلیمات

۱۔ کردار اور فضائل اخلاق کی نشوونما' خدا کا حصول اور اچھے اعمال کرنا سکھ کا بنیادی مقصد ہے۔

۲۔ سکھ مت کہتا ہے کہ انسان اپنے سابق اعمال کے ساتھ اس دنیا میں جنم لیتا ہے اور پچھلے نتائج ورثے میں پاتا ہے۔ تاہم کوئی شخص اپنی زندگی میں ہی اپنے اعمال' کردار اور قسمت کی صورت گری کر سکتا ہے۔ گرو کی رحمت مقدر تبدیل اور اعمال کا آئندہ رخ متعین کر سکتی ہے۔ دوبارہ جنم کا دارومدار فرد کی خواہش پر ہے۔ خدا تمام چیزوں کا مطلق ماخذ ہے۔ وہ تمام واقعات کی علت ہے۔ خدا کے نام پر سب کچھ قربان کر دو۔ خدا کا نور ہی روح کو درخشاں بناتا ہے۔

۳۔ سکھ مت تعلیم دیتا ہے کہ انا یا خودی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ انا خدا اور انسان کے درمیان پردہ ہے۔ ہمیں خدا کے عظیم ارادے کے سامنے اپنی انا قربان کر دینی چاہیے۔ انا تمام برائیوں کی علت ہے۔

۴۔ سکھ مت کہتا ہے کہ اچھے اور نیک اعمال کرو۔ نیک اعمال کے ذریعہ ہی ہم خدا

کے بہت سے نزدیک اور برے اعمال کے باعث بہت دور ہوتے ہیں۔

۵۔ سکھ مت خدا کی پدریت اور انسا کے بھائی چارے کی تبلیغ کرتا ہے۔ یہ انسانوں پر زور دیتا ہے کہ خوش اعتقادی کے ساتھ الوہی فرض جان کرانجام دیں۔ اگر ہم انسانوں کو اپنے بہن بھائیوں کی طرح پیار کرتے ہیں تو خدا کی جانب ہماری راہ واضح اور روشن ہو جائے گی۔ برادرانہ محبت اور عجز و انکساری ہی نانک کا بنیادی پیغام ہے۔

۶۔ گرو عبادت کی اہمیت پر خصوصی زور دیتے ہیں۔ گرونا نک نے کہا ''نانک آقا کی عبادت سے ہی کامیابی ملتی ہے۔ نہکہ مطالبوں اور احکامات سے'' عبادت اور خود سپردگی کے ذریعہ ہی خدا کی رحمت حاصل ہو سکتی ہے۔

۷۔ خدا میں جذب ہو جانا انسان کی حتمی کامیابی ہے جسے نروان کہتے ہیں بھگتی اور زمین کے ساتھ خدا پر غور و فکر سے ''نام'' کے مسلسل ورد سے اور گروؤں کی تعلیمات پر عمل کرنے سے نروان ملتا ہے۔

نتیجہ بحث

گرو گرنتھ صاحب بذات خود محبت اور بھائی چارے کے ہمہ گیر پیغام کی تجسیم ہے۔ گرو گرنتھ صاحب کہلانے والے مقدس صحائف لوگوں کے لیے الہام کا ایک دائمی ذریعہ ہیں۔ پہلے گرونا نک کے مطابق روحانی ترقی کی پانچ منازل ہیں۔ ان منازل کے نام دھرم کھنڈ' گیان کھنڈ' شرن کھنڈ' کرم کھنڈ' اور سچ کھنڈ ہیں جو بالترتیب فرض علم کوشش' رحمت اور صداقت کی منازل ہیں۔ ان کے خیال میں اخلاقیات روحانی بہتری کی بنیادیں تشکیل دیتی ہے۔ انہوں نے پرچار کیا کہ ''سچ سب سے اعلیٰ ہے لیکن سچی زندگی اعلیٰ ترین ہے''۔

سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ نے اپنی خودنوشت سوانح بچتر ناٹک میں کہا ہے کہ خدا ان سے یوں گویا ہوا ''میں نے تمہیں اپنا بیٹا بنایا' اور تم نے میری راہ کو وسعت دی جاؤ اور لوگوں کو راستبازی اور اخلاقی راستے کی تلقین کرو۔ اور انہیں برائی سے بچنا سکھا!''

(چوپائی ۲۹)

گرنتھ صاحب میں خود خدا کو ''جگت گرو'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سچا گرو صداقت اور علم کا سمندر ہے۔ اس کا تفویض کردہ علم ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ گرو بذات خود علم کا نور ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ دنیا کے لیے مشعل راہ ہیں۔

خدائی رحمت گرو گرنتھ صاحب کے فلسفہ میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ خدا ہمارے کرم (اعمال) کنٹرول حاصل کرتا ہے' لیکن اس نے ہمیں آزاد ادارے کی فہم دی ہے۔ خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرنے والے طمانیت کی حالت پا لیتے ہیں۔

گرو گرنتھ صاحب کا مذہب ہمہ گیر اور عملی ہے۔ محبت' انکساری' قناعت' خدا کی پدریت' انسانی بھائی چارے' تزکیہ نفس' زندہ چیزوں پر رحم' جسم اور ذہن کی پاکیزگی' روحانیت کی تلاش' مرد اور عورت کی برابری' دوسروں کی خدمت' کھانے پینے اور پہننے کے انداز میں آزاد خیالی کا پیغام اسے ایک ہمہ گیر مذہب بناتا ہے۔ یہ بھگتی اور خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مذہب ہے۔

☆☆☆

۱۷ :: جین مت

''صداقت' عدم تشدد اور نفس کشی مذہب کی بنیاد ہیں''۔

(مہاویر سوامی)

لفظ ''جین'' کو ''جینا'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''جی'' کا مطلب تسخیر کرنا ہے چنانچہ جینا کا لفظی مطلب ایسا شخص ہے جس نے تمام جذبات پر غلبہ پا لیا ہو۔ اور نجات حاصل کر لی ہو۔ ''جینوں'' کو تیرتھنکر بھی کہا جاتا ہے۔ ''تیرتھ'' کا مطلب دریا میں کھڑے ہونے کی جگہ یا بجرا ہے جو دریا عبور کرنے میں مدد دے۔

جین روایت کے مطابق راشو پھل اور مہاویر وردھمان آخری یعنی چوبیسواں تیرتھنکر تھا۔ مہاویر کی ولادت ۵۹۹ ق۔م اور وفات ۵۲۷ ق۔م میں ہوئی۔ اس کا جنم ویشالی (موجودہ بہار) کے ایک گاؤں میں ہوا۔ ابتدائی بچپن سے ہی مہاویر نے دنیا کا عارضی پن محسوس کر لیا تھا۔ اور ۳۰ برس کی عمر میں مرتاض بن گیا۔ آخر کار اسے چشم بینا عطا ہوئی۔ تب اس نے لوگوں کو اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ کا آغاز کیا۔

جین مت کا فلسفہ

مہاویر جین مت کا بانی ہے۔ جین مت تمام زندہ مخلوقات ...... پست یا اعلیٰ' حشرات یا انسان ...... کے لیے ایک مطلق تعظیم رکھتا ہے۔ مہاویر نے جس بنیادی مسلک پر زور دیا وہ پانچ قسموں اور بائیس پابندیوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں آگے بیان کیا جائے گا۔ نظریہ اہنسا (عدم تشدد) کے اصول کو مقبول عام بنانا اس کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ اسی اصول کی بنا پر اس نے بھکشوؤں کے ساتھ ساتھ گرہستوں کے لیے بھی اخلاقی ضابطہ بنایا۔ اس نے سات حقیقتوں کا فلسفہ پیش کیا۔

(۱) نظریہ علم

جینوں نے علم کو دو اقسام میں بانٹا۔ یعنی پرمان اور نیا یہ۔ پرمان چیز کے معروضی

علم کے حوالے سے ہے۔ اور نیایہ کسی مخصوص چیز کے بارے میں بصیرت ہے۔ پھر پرمان کا علم بھی بالواسطہ (اپروکشا) ہے۔ براہ راست علم عملی (دیاوہریکا) یا دیگر دنیوی (پرمارتھ) ہوتا ہے۔ بلاواسطہ عملی علم دو قسم کا ہے..... متی اور سوتر۔ بالواسطہ علم کی پانچ اقسام ہیں..... سمرتی' پرتیہ بھیجنا' ترک' انومان اور آگم۔

نیایہ بنیادی طور پر دو قسم کا ہے یعنی ارتھ نیایہ ارشبد نیایہ (معنوی اور لفظی)۔ ارتھ نیایہ مزدی چار زمروں میں تقسیم ہے۔ (۱) نگم نیایہ (۲) سمگر یہہ نیایہ (۳) ویاوہرا نیایہ (۴) رجوسوتر نیایہ۔ شبد نیایہ بھی سمبھی ردھا نیایہ اور ایوام بھوت نیایہ میں تقسیم ہے۔

جنان (علم) کی مندرجہ بالا درجہ بندی کو روح کی ترقی کی پانچوں حالتوں کے مطابق پانچ مختلف اقسام میں خلاصہ بند کیا جا سکتا ہے۔ متی' شروت' اودھی' مناپر یائے' ارو کیول۔ متی جنان کا حوالہ حسی تجربے کا عام عمل ہے جو عموماً ادراک بذریعہ حسیات سے مشروط ہوتا ہے۔ شروت جنان صحیفے کا منکشف کردہ علم ہے۔ اودھی جنان کا تعلق اس سے ہے کہ جسے ہم غیب دانی کے طور پر جانتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا ماورائے حس ادراک ہے۔ مناپر یائے دیگر اذہان میں خیالات کے علم سے تعلق رکھتا ہے۔ یوگ اور تپ اس علم کے ذرائع ہیں۔ کیول جنان وہ لامحدود علم ہے جس کے توسط سے ہم نجات یا موکشا حاصل کرسکتے ہیں۔

(۲) جین مابعد الطبیعیات

جین فلسفہ کے مطابق حقیقت غیر تخلیق شدہ اور ازلی ہے۔ حقیقت وہ ہے جو دائمیت کے درمیان وجود میں آتی ہے۔ اور عدم ظہور کی خصوصیت رکھتی ہے۔ جینوں کے مطابق سات حقیقی عناصر موجود ہیں۔ جیوا' اجیوا استروا' بندھا' سمورا' نرجانا اور موکشا۔ آیئے ان پر باری باری غور کرتے ہیں۔

جیوا (روح)

جین جیوا یا آتما کو بطور باشعور جوہر بیان کرتے ہیں جیوا اپنشدوں کی آتما ہی ہے۔ جیوا خود افروز ہے اور دیگر چیزوں کو بھی فروزاں کرتی ہے۔ یہ اعمال کے نتائج بھگتی ہے اور خلقی طور پر لامحدود ادراک لامحدود علم اور لامحدود قوت کی مالک ہوتی ہے۔ وسیع اعتبار سے بات کی جائے تو جیوا دو قسم کی ہے۔ بدھایا مقید اور مکتایا آزاد۔

اجیوا (غیر روح)

اجیوا پانچ قسموں کی ہے: اہلیت (دھرم)، نا اہلیت (ادھرم)، اثیر (آکاش)، مادہ (پدگل) اور وقت (کال) دھرم استیکیہ نہ تو مستعد ہے اور نہ ہی یہ دوسروں میں حرکت پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن یہ مستعد پدگلوں ارجیووں کو اپنے اعمال سر انجام دینے میں مدد دیتی ہے۔ یہ شکل ذائقے، لمس سماعت اور بو سے ماورا ہے۔ ادھرم اسیکیہ جیووں اور مادے کو حالت آرام میں مدد دیتی ہے۔ یہ بھی ازلی بے ہیت غیر متحرک ہے۔ آکاش استیکیہ جیوا، اجیوا، اھرم، اکال، اور پدگل کو ہم آہنگ بناتی ہے۔ آکاش دکھائی نہیں دیتا۔ یہ استخراجی معروض ہے۔ پدگل استیکیہ مادہ ہے۔ پدگل کا خفیف ترین جزو انو یا ایٹم ہے۔ یہ نا قابل تقسیم ہے۔ اسے لوگ آکاش......یعنی وہ جگہ جس میں دنیا موجود ہے...... کہتے ہیں۔ کال ''سمیہ'' کہلاتا ہے۔ کال ابدی ہے اور یہ پدگل کی پیداواروں کی علت بھی ہے۔

استروتو

کرم کے مادے کا یوگ کے ذریعہ سے جیوا کے جسم میں داخل ہونا استرو کہلاتا ہے۔ استرو جیوا کی قید کا باعث ہے۔ جسم، گفتار، اور ذہن کی سرگرمیوں کی مطابقت میں جیوا ایک قسم کا احساس محسوس کرتی ہے۔ ان تینوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہونے والا احساس کایا یوگ، ویگیوگ اور منو یوگ کہلاتا ہے۔ استرو کی چالیس قسمیں ہیں۔ ان میں سے پانچ حسیات اور عدم تشدد صدق وغیرہ بالخصوص اہم ہیں۔

باندھ تتو

پدگلوں کا جیوا پر غلبہ پالینا قید یا باندھ تتو کہلاتا ہے۔شعوری فکر اور احساسات قید کی بنیادی وجہ ہیں اور پدگل اسی افکار کا نتیجہ ہے۔حالت نجات میں جیوا کو بندھن سے آزادی مل جاتی ہے۔

(۳) جین اخلاقیات

راہ نجات یا موکشا مارگ جین مت کی اہم ترین تعلیم ہے۔راست عقیدہ، راست علم اور راست رویہ تری رتن یا تین زیور ہیں، جو مل کر راہ نجات کو مشکل کرتے ہیں۔

راست عقیدہ

تتوں کی حقیقی موجودگی پر یقین راست عقیدہ ہے۔اس کا مطلب راستی کی بھگتی ہے۔یہ جین مت کے بنیادی اصولوں پر مخلصانہ اعتقاد کا نام ہے۔اس عقیدے کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔

راست علم

کسی شبہے یا غلطی کے بغیر حقیقی نوعیت کا علم راست علم ہے۔راست علم میں جیوا اور اجیوا کی ابتدائی حالتوں کا تخصیص یافتہ علم موجود ہے۔راست علم کسی بھی شبیہ یا غیر یقینی پن سے آزاد ہے۔روح اور غیر روح کی فطرت جاننا لازمی ہے۔راست علم کے حصول کے لیے کرموں کا خاتمہ ہونا چاہیے۔

راست رویہ

کسی خواہش کے بغیر خارجی دنیا کی اشیاء کی جانب بے لوث وغیر جانبدار رویہ ہی راست رویہ ہے۔یہ روح کو ان کرموں سے نجات حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے جو قدر کی وجہ سے بنتے ہیں۔پانچ عظیم نیکیاں یہ ہیں۔(۱) اہنسا یا عدم تشدد (۲) ستیہ یا حق (۳) استیہ یا چوری نہ کرنا (۴) برہم چاریہ یا تجرد اور (۵) اپرگر یہہ یا تیاگ۔

اہنسا کا مطلب صرف تشدد نہ کرنا ہی نہیں بلکہ شفقت کرنا بھی ہے۔ اہنسا میں ذہن کی رفتار اور عمل تشدد سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ کسی بھی شے کو مارنے سے منع کرتا ہے روحانیت کے متلاشیوں کو نصیحت کی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں عدم تشدد کے اصول کی پیروی کریں۔

ستیہ یا صدق کا مطلب جھوٹ کا مکمل خاتمہ کر دینا ہے۔ جین فلسفہ میں صداقت کا مطلب صرف سچ بولنا ہی نہیں بلکہ اچھی اور خوشگوار بات کہنا بھی ہے۔ سچ سب کے لیے قابل قبول اور مفید ہونا چاہیے۔

استیہ ایک باعزت طرز عمل ہے مثلاً چیزیں نہ چوری کرنا اور نہ ہی دوسروں کی مادی چیزیں لینا۔ دوسروں کی جائیداد زندگی دولت نہیں چرانی چاہیے۔

ایثار ذات یا جذبات کی موجوں کو مارنا برہم چاریہ یا تجرد ہے۔ تجرد قول' فعل اور سوچ سب میں ہونا چاہیے۔ تمام خواہشات' چاہے ذہنی یا جسمانی' اعلیٰ یا خام' دنیاوی یا مافوق الفطرت کی مکمل قربانی بھی موزوں تجرید کی تقلید کے لیے اتنی ہی ضروری ہے۔

اپرگریہہ کا مطلب تمام دنیاوی فائدوں اور خواہشات کو ترک کر دینا ہے۔ یعنی بیرونی لگاؤ سے مکمل احتراز۔ قربانی کا اطلاق قول' فعل' دیکھنے' چکھنے اور سونگھنے کا کاموں پر بھی ہوتا ہے۔ لگاوٹ ہی دکھ کا سبب ہے۔

طرز عمل کے تمام قوانین کی اساس پر رحم ہے جس کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ صلے کی توقع رکھے بغیر عمل کرنا۔

۲۔ دوسروں کی فلاح میں خوشی اٹھانا۔

۳۔ کچلے ہوئے لوگوں کی تکالیف کم کرنے کے لیے ان سے اظہار ہمدردی کرنا۔

۴۔ مجرموں پر ترس کھانا۔

(۴) جین نیکی (پنیہ)

نیکی یا پنیہ جین مت کے انتہائی زبردست اصولوں میں سے ایک ہے۔ اچھے عمل تک

لے جانے اور ذہنی و روحانی سکون حاصل کرنے والا اچھا عمل نیکی کہلاتا ہے۔جین مت کے مطابق نیکی صرف اچھائی کا علم ہی نہیں بلکہ اچھائی سے محبت بھی ہے۔محبت ایک اندھی تحریک کا احساس نہیں۔یہ وہ مسرت ہے کہ جو کسی شے کے تصور کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔جینی کہتے ہیں کہ محبت اور علم کے علاوہ جہد مطلق بھی لازمی ہے' یعنی ذاتی ارادے کا اقدام جس کے بغیر نیکی کی انجام دہی اور تکمیل نہیں ہوسکتی۔وہ یہ ہیں (۱) خوراک دینا (۲) پانی مہیا کرنا (۳) ننگوں کو کپڑے دینا (۴) بے گھروں کو چھت فراہم کرنا (۵) چارپائی یا بستر مہیا کرنا (۶) ناراض کے بغیر بات کرنا اور (۷) تہنیت پیش کرنا۔

(۵) جین مت بطور مذہب

جین مت میں خدا خالق یا فنا کرنے والے کے طور پر کسی خودمختار شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں۔جین مت کا عقیدہ ہے کہ ہر انفرادی روح اپنی تخلیق کی ذمہ دار ہے۔اور ہر اہل روحانی متمنی الوہیت حاصل کرسکتا ہے۔موزوں روحانی وظائف کی انجام دہی سے یہ منزل حاصل کی جاسکتی ہے۔اور یہ کہ تمام ارواح بھی خداؤں جتنی ہی قابل پرستش ہیں۔

چونکہ دنیا بے ابتدا ہے۔اس لیے دنیا کی تخلیق کا سوال نہیں ابھرتا۔دنیا بغیر کا عمل ہے۔اگر خدا دنیا کا خالق ہے تو وہ تخلیق دنیا سے پہلے بطور خالق موجود نہیں ہوسکتا تھا۔انسان بھی بہت سی چیزیں تخلیق کر لیتے ہیں اور اس لیے خدا قادر مطلق نہیں۔اور ہم اسے دیکھ نہیں پاتے اس لیے وہ حاضر و ناظر بھی نہیں۔اگر چہ جین خدا کا نظریہ مسترد کرتے ہیں۔لیکن بدھسٹوں کی طرح وہ روح کی خلقی الوہیت پر یقین رکھتے ہئں۔ہر روح ذاتی جدوجہد کے ذریعہ الوہیت کی منزل حاصل کرسکتی ہے۔جین مت میں سدھوں' اچاریوں اپادھیاییوں اور سادھوؤں کی پاجا کرنے کی اجازت ہے۔

جین مت اس حد تک الحاد پرستی ہے کہ یہ ویدوں کی حاکمیت قبول نہیں کرتا۔اگر الحاد

پرستی کا مطلب خدا پر عقیدہ نہ رکھنا ہے تو جین مت کو صحیح معنوں میں ملحدانہ قرار دیا جانا مشکوک ہے۔جین خدا پر یقین نہیں رکھتے لیکن ذاتی جدوجہد کے ذریعہ خلقی الوہیت پر ان کا عقیدہ ہے۔جین مت بدھ مت سے زیادہ روحانی اور اخلاقی ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے جینی الحاد پرست نہیں' کیونکہ خدا سے انکار کا مطلب الحاد نہیں۔جس طرح ہر آزادی یافتہ روح خدا ہے' اسی طرح مہاویر کو جین مت میں بطور خدا لیا گیا۔

موکشا (نجات)

کرم اور جنم مرن کے چکروں سے آزاد ہونے کے بعد روح نجات حاصل کرتی ہے۔نجات حاصل کر چکنے والا شخص ''سدھا'' کہلاتا ہے۔ایک روح کا مل مادے کے ساتھ تعلق ہی روح کی قید کا باعث ہے۔چنانچہ روح کو مادی دنیا کے بندھنوں سے بالکل بے تعلق کر لینے کی منزل ''موکشا'' ہے۔لاعلمی کے سبب سے روح مادے کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہے۔راست علم کے ذریعہ لاعلمی دور کی جاسکتی ہے۔راست علم کا حصول تیرتھنکروں کے صحائف اور تعلیمات کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔راست علم' راست عقیدے اور راست طرز عمل کی مدد سے لاعلمی کا مکمل خاتمہ ممکن ہے۔روح اپنی معیاری فطرت کے لامحدود عقیدے' علم 'مسرت اور توانائی سے منور ہوتی ہے۔راست عقیدہ راست علم اور راست طرز عمل ...... یہ تین عناصر جین مت کے تین رتن کہلاتے ہیں تینوں راستے کاملیت کے لیے ایک ہی جتنے ناگزیر ہیں۔نجات کی حالت کاملیت کی حالت ہے۔نجات یافتہ روح کی حالت میں ہی عمل اور خواہش سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔کاملیت کی حالت کو مجہول طور پر نہایت جذبات اور دنیا کے بندھنوں سے آزادی بیان کیا جاتا ہے۔جس میں روح ورائے سخن طمانیت اور شادمانی حاصل کرتی ہے۔

جین مت میں مذہبی طبقے

جین مت وسیع پیانے پر دو حصوں میں تقسیم ہے: شویتامبر اور دیگمامبر۔اول الذکر سفید ان سلا لباس پہنتے ہیں۔اور موخر الذکر بالکل ننگے رہتے ہیں جینوں کے درمیان

بمشکل ہی کوئی عقائدانہ تقسیم موجود ہے۔ ان دو دھڑوں کے درمیان یہ تقسیم صرف اس بنیاد پر ہے کہ دنیاوی اشیاء کے مکمل تیاگ کی علامت کے طور پر بھکشوؤں کو مکمل ننگا رہنا چاہیے یا نہیں۔ علاوہ ازیں دیگمامیر زیادہ پرجوش اور کٹر ہیں۔

جین صحائف

جین فلسفہ و مذہب میں آخری تیرتھنکر مہاویر مطالعہ کا بنیادی موضوع ہے۔ صرف اس کے پیروکاروں نے اس کے اقوال یاد کر لیے اور بعد میں تحریر کیے۔

بالعموم جینوں کے پاس دو قسم کے اصلی تحائف ہیں۔ انہیں ''پورو'' اور ''انگ'' کہا جاتا ہے۔ پوروؤں کی تعداد ۱۴ ہے ارو یہ ناپید ہو گئے ہیں۔ تاہم اس وقت ۴۱۱ انگ ۲۲ ایا نگ، ۱۰ ایا کنا، ۲ چھید، ۴ مول سوتر اور دو دیگر سوتر جین ادب کا مرکزی حصہ ہیں۔

خلاصہ

جین فلسفہ کو صرف ایک فقرے میں مختصراً بیان کیا جا سکتا ہے۔ زندہ اور غیر زندہ اشیاء، ایک دوسرے سے رابطے میں آنے پر، مخصوص توانائیاں پیدا کرتی ہیں۔ جو پیدائش موت اور زندگی کے مختلف تجربات وقوع میں لاتی ہیں۔ نجات تک پہنچانے والی راہ تربیت کا ذریعہ عمل روکا اور پیدا شدہ توانائیوں کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مختصر بیان کا بغور تجزیہ بتاتا ہے کہ اس میں سات مفروضے شامل ہیں۔ (۱) کہ کوئی زندہ یا ہست کہلانے والی چیز موجود ہے (۲) کہ کوئی غیر زندہ یا عدم کہلانے والی شے بھی موجود ہے (۳) کہ دونوں کا آپس میں تعلق بنتا ہے (۴) کہ تعلق کے نتیجہ میں کچھ توانائیاں پیدا ہوتی ہیں (۵) کہ تعلق کا یہ عمل روکا جا سکتا ہے (۶) کہ موجودہ توانائیاں ختم بھی ہو سکتی ہیں اور (۷) نجات قابل حصول ہے۔ یہ سات مفروضے سات نتو یا سات حقیقتیں ہیں۔

علاوہ ازیں جین علم کے پانچ درجوں کی بات کرتے ہیں جو معرفت کل تک لے جاتے ہیں۔ مہاویر تین درجے لے کر اس دنیا میں پیدا ہوا تھا...... متی جنان یعنی علم

معرفت شروت جنان یعنی سماعت کے ذریعہ علم' اوراودھی جنان یعنی احساس کے ذریعہ علم اپنی روحانی تلاش کا آغاز کرنے کے فوراً بعد ہی اس نے دو دیگر درجے بھی حاصل کر لیے' منہ پریایہ یعنی ذی شعور ہستیوں کی سوچیں' اور کیول جنان یعنی معرفت کل۔

جین مت برابری کے طرز عمل پر بہت زور دیتا ہے۔ یہ طرز عمل مشہور برہمنی تصور برہمہ سے بہت زیادہ ملتا ہے۔ اوراس میں سارا مذہبی رویہ اور فلسفیانہ سوچ شامل ہے جو بطور برہمچاریہ برابری کے طرز عمل کوفروغ دینے میں مدد دیتی ہے۔ برابری کے طرز عمل نے مذہبی رویے اور فلسفیانہ فکر کے میدان میں بھی عدم تشدد کی صورت میں اظہار پایا۔ تمام جین رسومات داخلی یا خارجی' لطیف یا کثیف' عدم تشدد کے گرد متشکل کی گئیں۔

عدم تشدد کا نفاذ واضح کرنے کے لیے جین مت نے مندرجہ ذیل کو تشکیل دیا۔ (۱) آتماؤں کی سائنس (ودیا) (۲) کرم (عمل) کی سائنس (۳) رویہ کی سائنس اور (۴) کائنات (لوک) کی سائنس۔

جین نظام نے سابق کرم اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے میں آزادی پانے کی خاطر سخت ترین ریاضتوں پر عمل کرنے کو تمام اہمیت دی۔ اس نے آواگون سے بچنے کی خاطر جسمانی تجرد اور عدم تشدد پر خصوصی زور دیا' کیونکہ دوبارہ جنم کا چکر ہی گناہوں اور دکھوں کا باعث ہے۔

بدھ مت اور جین مت دونوں کی پیدائش ہندو مت میں سے برہمنی پروہتانہ جبر کے خلاف ایک قسم کے رد عمل کے طور پر ہوئی۔ انہوں نے ویدوں کی حاکمیت کو مسترد کیا۔

چنانچہ جین مت دنیا کے قدیم ترین زندہ مذاہب میں سے ایک ہے۔ اور اب بھی ہزاروں لوگوں کی روحانی طمانیت اور الوہی زندگی کا ضامن ہے۔ مہاویر کا تاریخی تجرد آج جین مرد وخواتین میں قائم ہے جو اپنے عظیم گرو کی راہ پر چلتے ہوئے کاملیت حاصل کرنے کی خاطر ہر چیز تیاگ دیتے ہیں۔

☆☆☆

۱۸ :: کنفیوشیت اور تاؤمت

""اگر قوم میں نظم ہو تو دنیا میں امن ہوگا""......(کنفیوشس)

""برائی کے بدلے میں اچھائی کرو""۔......(لاؤزے)

کنفیوشیت کا فلسفہ

چین کا مذہب کنفیوشیت تاؤمت اور بدھ مت پر مشتمل ہے۔ کنفیوشیت اور تاؤمت چین کے مقامی مذاہب ہیں جبکہ بدھ مت ۶۵ عیسوی میں ہندوستان سے وہاں گیا تھا۔ کنفیوشیت کا بانی کنفیوشس ہے اور لاؤزے نے تاؤمت کی بنیاد رکھی۔ کنفیوشس اور لاؤزے کو پیغمبروں یا کرشن اور بدھ والا درجہ تو نہیں دیا جاتا۔ البتہ انہیں عظیم بزرگ اور فلسفی مانا جاتا ہے۔

روایتی مفہوم میں کنفیوشیت کو مذہب نہیں قرار دیا جاسکتا۔ نہ ہی یہ کوئی مذہبی سلسلہ ہے۔ کنفیوشس نے کوئی نیا مذہب نہیں پیش کیا تھا' لیکن اس نے دنیا کو انسانی اخلاقیات اور نیکی کے طاقت ور اصول دیے۔

کنفیوشس کا اصل نام کنگ چن تھا۔ نوع انسانی کے دیگر عظیم رہنماؤں کی طرح کنفیوشس کا جنم بھی معجزاتی بتایا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش ۵۵۱ ق۔م میں ہوئی۔ بیوہ ماں نے تنگدستی اور محنت ومشقت والی زندگی گزاری کر اس کی پرورش کی۔ بائیس تیئس سال کی عمر میں کنفیوشس کو معلم کی نوکری مل گئی۔ بعد میں وہ تاریخ کا ایک عظیم ترین استاد مشہور ہوا اور اس نے اپنی عملی دانش کے ذریعے زبردست شہرت پائی اس کے بہت سے شاگرد بن گئے۔ کنفیوشس نے اپنا زیادہ تر وقت قدیم روایات اور عقائد کے بارے میں دستیاب ادب کو جمع اور مرتب کرنے میں گزارا۔

تاہم کنفیوشس کا ذاتی مقصد پڑھانا نہیں تھا۔ بلکہ عوام پر حکومت کرنا تھا۔ وہ پوری طرح قائل تھا کہ حکومتی حیثیت کے ذریعے ہی وہ اپنا سب سے بڑا مقصد پورا کرسکتا

ہے۔......یعنی سماجی سلسلے کی تشکیل نو اور اصلاح۔ چنانچہ وہ اپنی مقامی ریاست میں وزیر ترقیات اور وزیر انصاف بن گیا۔کنفیوشس نے ۵۰ سال کی عمر میں سارے چین کا سفر کیا اور اپنی تعلیمات کو فروغ دینے کے بعد ۷۳ برس کی عمر میں فوت ہوا۔

اس کی تعلیمات اور انداز حیات نے چینی معاشرے پر ایک اہم اور انقلابی اثر ڈالا۔ ''ایک اعلیٰ انسان کے نو مقاصد ہوتے ہیں: واضح طور پر دیکھنا' سنی ہوئی بات کو سمجھنا' برتاؤ میں گرم جوشی کا مظاہرہ کرنا' فرض نبھانا' قول پورا کرنا' محنت سے کام کرنا' شک ہونے پر پوچھ لینا' مشکلات کے بارے میں سوچ کر غصہ کرنا' فائدہ ملنے پر حق یاد رکھنا''۔

''دل میں سچائی ہوگی تو کردار بھی خوبصورت ہوگا۔ کردار میں خوبصورتی ہوگی تو گھر میں ہم آہنگی پائی جائے گی۔ گھر میں ہم آہنگی ہونے سے قوم میں ہم آہنگی ہوگی۔ قوم میں ہم آہنگی ہونے سے پوری دنیا میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی''۔

اس نے اپنا پہلا نظریہ "Li" استعمال کیا جس کا مطلب رسوماتی کے علاوہ تعظیم بھی ہے۔ ہم اسے درست راستہ یا درست رویہ بھی کہتے ہیں۔ "Li" ہماری اندرونی فطرت اور رویے کا بنیادی اصول ہے۔

دوسرا نظریہ "Yi" ہے جس ک مطلب چیزوں کو سرانجام دینے کا بہترین طریقہ ہے۔ "Yi" چیزوں کا وہ انداز عمل ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اپنی اپنی فطرت کے مطابق کام کریں اور یہی بہترین طرز عمل ہے۔

تیسرے نظریہ "Jen" کا مطلب ساکھ ہے یعنی سماجی اعتبار سے بہترین کام کرنے پر آمادگی۔ "Jen" کے مطابق ضروری ہے کہ ہر فرد کو اس کی اپنی فطرت کے مطابق کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ "Jen" والا انسان ہر شخص کو جوں کا توں قبول کر لیتا ہے۔

چوتھا اور آخری نظریہ "Chih" ہے۔ یہ ایک مثالی حالت ہے جو درجہ بدرجہ حاصل

ہوتی ہے۔ "Chih" میں ہر شخص کسی سوال کا سامنا کیے بغیر عادت کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ یہ وہ اعلیٰ ترین مذہبی مثالی نمونہ تھا جسے کنفیوشس خود بھی نہ پا سکا تھا۔

کنفیوشیت کا تعلق بنیادی طور پر اخلاقیات اور انسان کے سماجی سیاسی پہلوؤں سے ہے۔ کنفیوشس کو عموماً اخلاقیات کا معلم کہا جاتا ہے۔ اس نے خدا سے زیادہ انسان اور معاشرے میں انسان کے فرائض پر زور دیا ہے۔

کنفیوشس توثیق کرتا ہے کہ تمام انسان الوہی طور پر اچھے ہیں۔ اس نے کہا کہ پیدائش کے وقت تمام انسان اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ آخر تک اچھے نہیں ہوتے۔ کنفیوشس خلوص دل کے ساتھ معاشرے کی بہتری، بھلائی اور بہبود کا متمنی تھا۔ امن اور ہم آہنگی کنفیوشس کا سماجی مثالی تصور ہے۔

کنفیوشس کے مطابق نیک آدمی کو تین خوف تھے (۱) آسمانی فیصلے کا خوف (۲) عظیم انسانوں کا خوف اور (۳) اولیاء کا خوف۔ اس نے کہا کہ اخلاقی آدمی کی زندگی کائناتی نظم وضبط کی تمثیل ہے۔ وہ زور دیتا ہے کہ اعلیٰ ترین انسانی کامیابی اپنے اخلاقی وجود کا سراڈھونڈنا ہے جو ہمیں کائناتی نظم کے ساتھ باندھتا ہے۔

کنفیوشس نے کہا کہ ''سچ خدا کا قانون ہے'' سچ سے مراد ''واحد'' ہستی کی معرفت ہے۔ مطلق سچائی ناقابل تردید ابدی، خودموجود اور لامحدود ہے۔ کنفیوشس کے مطابق سماجی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی اعیان اخلاقیات میں مرکوز ہیں۔ نیکی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور محبت کے بغیر زندگی موت ہے۔ زندگی کی نشوونما کا دارومدار نیکی کی نشوونما پر ہے۔

تاؤمت

تاؤمت کا بانی لاؤزے ۶۰۴ ق۔م میں پیدا ہوا۔ لاؤزے (Lao-Tse) کا مطلب ہے جوان لڑکا یا فلسفی یعنی جو شخص بڑا ہو جانے پر بھی بچوں جیسا رہتا ہے۔ اسے عام لوگوں سے زیادہ دانشمندی ودیعت ہوئی تھی۔ اس کا مقصد خود کو بے نام اور مخفی رکھنا

تھا۔اس نے ایک چھوٹی سی کتاب تاؤ تے چنگ (راستہ اور اس کی قوت) لکھی جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔یہ کتاب اچھی زندگی گزارنے کے لیے رہنمائی کرتی ہے۔

لاؤزے کی تعلیمات

حکیم بننا لاؤزے کی منزل مقصود تھی' یا چوانگ زے کے الفاظ میں ایسا شخص بننا جس کے اندر حکمت اور باہر ہمدردی ہو۔لاؤزے کے مطابق تاؤ (Tao) تمام چیزوں کا انداز اصول جوہر اور معیار ہے۔جس کے مطابق انہیں ہونا چاہیے۔اپنے جوہر میں یہ ابدی مطلق اور زمان ومکان سے ماوراء ہے۔

تاؤ کو آسمانی راہ کہا جاتا ہے۔لیکن انفرادیت کے حوالے سے اسے انسان کی راہ کہتے ہیں آسمانی راہ اور انفرادی راہ حقیقت میں ایک ہونے کے باوجود بہت مختلف ہیں۔آسمانی راہ ہی آقا کا کردار ادا کرتی ہے۔اور''انسانی راہ'' خادم کی راہ ہے۔

نفرت اور ہمدردی' لین دین' تادیب اور ہدایت' موت وحیات...... یہ آٹھ چیزیں زندگی کی اصلاح وترمیم کے آٹھ ذرائع ہیں۔جب محبت اور دشمنی' نفع ونقصان' پسندیدگی اور ناپسندیدگی حکیم کو متاثر نہیں کرتی تو وہ دنیا کے لیے قابل عزت بن جاتے ہیں۔

لاؤزے کا کہنا ہے کہ تاؤ کا راستہ عمل کرنے کا سوچے بغیر عمل کرنا۔معاملات کی مشکل محسوس کیے بغیر انہیں نمٹانا۔کسی ذائقے کا امتیاز کیے بغیر چکھنا۔چھوٹے کو بڑا اور کم کو بہت زیادہ سمجھنا اور ہمدردی کے ساتھ چوٹ کی تلافی کرنا ہے۔

لاؤزے کا کہنا ہے کہ ایک پاکیزہ آدمی کا دل سینکڑوں دلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کا کوئی ایک مخصوص دل نہیں ہوتا۔پاکیزہ آدمی ان سب کو اپنے بچے سمجھتا ہے۔وہ عادات میں سادگی پسند کی نیکی سکھاتا ہے۔''اپنی منصوبہ بندی ترک کردو اپنے منافعے چھوڑ دو تو چور ڈاکو ختم ہو جائیں گے''۔لاؤزے کا فلسفہ تین نکاتی ہے۔اول حقیقت مطلق کا راستہ حقیقت مطلق کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔دوم کائنات یا افلاک کا راستہ جسے ویدانت کی زبان میں جیو آتما کہا جا سکتا ہے۔چنانچہ بنی نوع انسان کا سابقہ ایک ایسی

ناگزیریت سے پڑتا ہے جس کے خلاف وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

سوم انسان کا راستہ۔ یہ زندگی کا فلسفہ اور نظم ہے۔ اسے انداز حیات بھی کہتے ہیں۔ فطرت عین فطرتی اور دانشمندانہ طور پر عمل کرتی ہے۔ دانا آدمی فطرت پر ایک دوست کی طرح بھروسہ کرتا ہے۔

تاؤ

اصطلاح ''تاؤ'' کی تشریح مختلف انداز میں کی جاتی ہے۔ مختلف لوگوں نے اس کا مطلب ''راستہ'' ''ابدی قول'' ''ابدی ہستی'' ''استدلال'' وغیرہ بتایا ہے۔ جدید سائنس میں یہ بطور ''فطرت'' موجود ہے۔ بدھسٹ ''تاؤ'' کی اصطلاح نروان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لاؤزے کے مطابق تاؤ واحد ہے۔ یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ یہ لافانی اور ناقابل تردید ہے۔ یہ بے نام اور غیر مادی ہے۔ اور حسیات سے ناقابل ادراک ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ اور ہم اسے ''یکساں رو'' کا نام لیتے ہیں۔ ہم اسے سنتے ہوئے بھی نہیں سنتے' اور اسے ''ناقابل سماعت'' کا نام دیتے ہیں۔ ہم اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سمجھ نہیں پاتے اور اسے ''لطیف'' کا نام دیتے ہیں۔ ان تین خصوصیات کی وجہ سے تاؤ کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ان تینوں کو ملا کر ہم واحد کو حاصل کرتے ہیں۔

لاؤزے اور کنفیوشس

لاؤزے کا فلسفہ کنفیوشس کے فلسفہ سے واضح طور پر مختلف ہے۔ کنفیوشس نے اچھی حکومت قوانین عدالت نیک اطوار پر زور دیا جبکہ لاؤزے اخلاقیات کی بجائے لوگوں کی فطری بے ساختگی اور آزادی پر یقین رکھتا تھا۔ کنفیوشس نے زندگی کی خارجی عادات میں اصلاح کرنا چاہی۔ لیکن لاؤزے لوگوں کے دل کو اندر سے ٹھیک کرنے کا خواہشمند تھا۔

کنفیوشس نے کہا کہ ''جو تم پسند نہیں کرتے وہ اپنے ساتھ کرو' دوسروں کے ساتھ نہیں''۔لیکن لاؤزے کہیں آگے تک گیا اور کہا ''برائی کے بدلہ میں اچھائی کرو''۔

لاؤزے نے ایک قسم کی براہ راست' اندرونی ' وجدانی بصیرت کی بات کی جو کنفیوشس کے دانشورانہ علم سے بہت مختلف تھی۔

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

۱۹ :: شنتومت

''خدا کی مشیت سے روگردانی نہ کرو''۔

(شنتو)

شنتومت جاپان کا مذہب ہے۔ شنتو کا لفظی مطلب ''دیوتاؤں کا راستہ'' ہے۔

شنتومت کی تعلیمات

(۱) خدا کی مشیت سے روگردانی نہ کرو۔

(۲) آباؤاجداد کی جانب سے اپنے فرائض نہ بھولو۔

(۳) ریاست کے احکامات کی خلاف ورزی کا جرم نہ کرو۔

(۴) خداؤں کی عمیق اچھائی کو نہ بھولو جس کے ذریعہ آفات اور بدقسمتیاں اپنا رخ پھیر لیتی ہیں اور بیماری سے شفا ملتی ہے۔

(۵) یہ مت بھولو کہ دنیا ایک بہت بڑا خاندان ہے۔

(۶) اپنی شخصیت کی حدود مت بھولو۔

(۷) دوسروں کے غصے میں آنے پر بھی غصے میں نہ آؤ۔

(۸) اپنے کام میں سستی نہ کرو۔

(۹) تعلیمات پر الزام نہ دھرو۔

(۱۰) بیرونی تعلیمات کے پیچھے اندھا دھند نہ دوڑو۔

کامی

روحوں کو ''کامی'' کہتے ہیں جس کا لفظی مطلب ''برتر ہستیاں'' ہے۔ معبودوں کی دو قسمیں ہیں: نظری خدا اور انسانی خدا۔ پہلی قسم تجسیم کا نتیجہ ہے اور دوسری قسم آباؤاجداد کی پرستش کا۔ سورج کی دیوی' خوراک کی دیوی اور زمین کا دیوتا سب فائدہ بخش ہیں اور کامی میں شمار ہوتے ہیں۔ شنتو کے فطری دیوتا' یعنی سورج' چاند' زمین' سمندر' پہاڑ

'بارش' آگ' صاعقہ' بنیادی طور پر عبادت کے حقیقی مادی معروض ہیں۔ چنانچہ شنتو مت نہایت کثرت پرست ہے اور اس کے دیوتاؤں کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ تمام دیوتا شنتو مت دینیات میں دانش' ہمت اور لطف و کرم' ذہانت' عزم اور محبت کی علامت ہیں۔

شنتو خانقاہیں اپنی سادگی کی وجہ سے نہایت ممتاز ہیں اور اس مذہب میں کوئی پیچیدہ رسومات موجود نہیں۔ شنتو دیوتاؤں کو ریاستی شنتو گھریلو شنتو اور فرقہ وارانہ شنتو کے طور پر الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔

ریاستی شنتو

مذہب کی حیثیت میں شنتو مت کو مختلف مذہبی وظائف کی پیچیدہ اور تخصیص یافتہ درجہ بندیوں کے امور سے آگہی کا سامنا لازماً کرنا پڑتا ہے ریاستی شنتو خانقاہوں نے بدھ کا رتبہ حاصل کیا۔ ریاستی شنتو پادری شادی کی تقریبات سرانجام نہیں دیتے بلکہ ریاست کے شاہی وظائف ادا کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل تعظیم شنتو ''آسے'' کہلاتا ہے۔ جاپان میں اس قسم کے دیوتا کو قادر مطلق کہا جاتا ہے۔

گھریلو شنتو

مقامی شنتو ذاتی نوعیت کے ہیں اور ان دیوتاؤں کی عبادت گھروں میں کی جاتی ہے۔ شنتو کی گھریلو رسومات سادہ سی ہیں گھر کے کسی کمرے کے ایک کونے میں ایک شیلف پر خداؤں کے نام کندہ کر دیے جاتے ہیں' بالخصوص سورج کی دیوی اور آسے کے دیوتاؤں کے نام۔ کبھی کبھی بدھ بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ شنتو

فرقوں کی موٹی موٹی درجہ بندی پانچ گروہوں میں کی جا سکتی ہے جنہیں ہم شنتو فرقے' کنفیوشی فرقے' پہاڑی فرقے' مقدس فرقے اور روحانی شفاء کے فرقے کہتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر شنتومت جاپان میں ختم ہوگیا۔ شہنشاہ نے سرکاری طور پر اپنے الوہی رتبے کو مسترد کردیا۔ تاہم خانقاہوں میں جانے کی روایت مقبول عام رہی۔

☆☆☆

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

۲۰ :: زرتشت مت

''اچھائی، نیکی اور افضل ترین چیز پاکیزگی ہے''۔

(زرتشت)

زرتشت ایک سچا مذہب اور کائنات کے قادر مطلق خدا ''اہورامزدا'' کی عبادت کا رواج ڈالنے کے لیے دنیا میں آیا۔ محققین کو یقین ہے کہ زرتشت کی پیدائش ۶۶۰ ق۔م میں ہوئی تھی۔ کئی دیگر فلاح کاروں کی طرح زرتشت بھی کنواری ماں کے بطن سے پیدا ہوا اور انتہائی حیران کن واقعات والی روحانی علامتوں اور شگونوں کے ستارے کا نقیب تھا۔ اس نے سات برس کی عمر میں اہل عقل کے ساتھ دلیل بازی میں زبردست فراست کا مظاہرہ کیا۔ مذہبی عہد و پیماں پر بیس برس عمل کرنے کے بعد اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور دربدر پھرتا رہا۔ اس نے پاکیزگی اور راستبازی کی زندگی بسر کی، دس برس تک دشت وصحرا کی خاک چھانی اور تنہائی میں مختلف ریاضتی مشقیں کرتا رہا۔

روحانی نجات کے لیے خود کو تیار کرنے کی غرض سے دس طویل برس گزارنے کے بعد زرتشت کو اپنی زندگی کے تیسویں سال میں نور مطلق کا دیدار ہوا اور وہ اہورامزدا کا عالمی شہرت یافتہ پیغامبر بن گیا۔ اہورامزدا کا حکم بجالاتے ہوئے اس نے ایک عظیم مذہب کا پرچار شروع کیا جو بعد ازاں ''زرتشت مت'' کے طور پر مشہور رہا۔

زرتشت کی تعلیمات

مسیح کے مانند زرتشت نے بھی اپنا مشن تقریباً تیس برس کی عمر میں شروع کیا۔ ابتداً اس نے شیطان کی پرستش کرنے والوں اور بے انسانوں کا مذہب تبدیل کیا وہ اپنا پیغام پھیلانے کی غرض سے چین اور ہندوستان بھی گیا لیکن زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اسے بہت سے شیطانوں، مشکلات اور حریص خواہشات و گناہ کے خلاف لڑنا پڑا اور انجام کار فتح مند رہا۔ اپنی فیاض فطرت اور پرامن طریق کار کی وجہ سے اسے اپنا نیا مذہب قائم

کرنے اور نوع انسانی کی مادی و روحانی بہبود کی بنیاد ڈالنے میں کامیابی ہوئی۔ اپنی عمر کے چوتھے عشرے میں زرتشت نے سات پیش گوئیاں کی تھیں اور ان میں سے چھ بڑے فرشتوں کے ساتھ گفتگو کی جو حیوانات' آتش' دھاتوں' مٹی' پانی' اور نباتات کے تخت نشین آقا تھے۔ چنانچہ ان دس برس کے دوران اس نے وہ تمام روحانی بلندیاں اور حکمت حاصل کر لی جو زرتشت مت کے صحائف میں شامل ہیں۔

شاہ ایران وشتاسپ پیغمبر زرتشت کے معجزات اور مافوق الفطرت قوتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ بیماروں کو اچھا کیا' اندھوں کو بصارت دی متعدد آتش کدے قائم کیے' شیطان کی پرستش' جادو ٹونے اور منتر کی حوصلہ شکنی کی۔ ملک سے متعدی امراض کو ختم کیا اور بہت سی آفات اور تباہیوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔

الٰہیات کی تاریخ میں اپنی اہمیت کے باعث زرتشت مت خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی الٰہیات کی بنیاد دو ماورائے فطرت سلطنتوں پر قائم ہے ایک نور کی سلطنت جس کا حکمران خدا ہے' اور دوسری برائی کی سلطنت جہاں شیطان کی حکومت ہے۔ اس کی تعلیمات کے مطابق مذہب کا مقصد انسانوں کو رہبانہ سخت گیری اور مادی اشیاء کے مکمل تیاگ کے ذریعہ بادشاہ ظلمت کی قید سے نجات دلانا ہے۔ زرتشت کے خیالات سارے فارس میں پھیل گئے۔ ان کا دائرہ کار صرف شاہی خاندان کی حدود سے نکل کر اہل ایران و فارس تک پہنچ گیا۔

زرتشت مت کا مذہبی......فلسفیانہ تصور

زرتشت مت آریائی نسل کا مذہب رہا ہے۔ زرتشت مت اور ہندو مت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اپنی اصلی حقیقت میں یہ دونوں مذاہب وحدت پرست ہیں لیکن دیکھنے میں کثرت پرست نظر آتے ہیں۔ دونوں میں سوما ہوما پرستش کی اعلیٰ ترین صورت اور ''اگنی'' (آتش) مرکزی دیوتاؤں میں سے ایک ہے۔ زرتشت مت کے قدیم مذہبی صحائف ''اوستا'' میں آگ ایک مقدس علامت تھی اسے اہورامزدا کا سورج خیال کیا گیا

ہے۔ تاہم خود زرتشت نے آگ کی پرستش کرن کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ وہ کائنات کے خدائے مطلق کی عبادت کرنے پر زور دیتا تھا، جس کا نام ''اہورا مزدا'' تھا۔ آگ تو محض ایک مقدس چیز تھی خدا کی علامت، جیسا کہ تمام قدیم قربانی کی رسومات نظر آتی ہیں۔ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ زرتشت نے یہ پرچار کیا کہ نوع انسانی کے لیے مفید اور اچھی تمام چیزیں اہورا مزدا کی تخلیف کردہ ہیں اور برائی اور شر ''اہرمن'' یا شیطان کی تخلیق ہے۔

یہ دو قوتیں یعنی اہورامزدا اور اہرمن بالترتیب نور اور ظلمت ہیں۔ زرتشت نے نفی، تباہی، جھوٹ جہالت، بدی، کو بری روح اور صداقت، ایمانداری، بدن ار ذہن کی پاکیزگی کو مقدس یا پاک روح قرار دیا۔ پاکیزگی اچھائی ہے۔ پاکیزگی تمام اچھائیوں میں افضل ترین ہے۔ پاکیزگی مسرت ہے۔ زرتشت کے خیال میں مسرت پاکیزگی سے ملتی ہے۔ منشائے ایزدی پاکیزگی کا ضابطہ ہے۔ پاکیزگی کو زرتشت مت کا حتمی مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ پاکیزگی کا مطلب جسم اور ذہن دونوں کی پاکیزگی ہے۔ یہ پاکیزگی اچھی سوچوں، اچھی باتوں اور اچھے اعمال سے قابل حصول ہے۔

زرتشت جنت اور دوزخ میں یقین رکھتا تھا۔ اس نے کہا کہ اچھے اعمال کرنے اور اچھی سوچیں رکھنے اور اچھی اچھی باتیں کرنے والے جنت میں جائیں گے۔ اور لافانی زندگی پائیں گے۔ جبکہ برے خیالات، برے اعمال اور بے الفاظ گناہگار کو ابدی دوزخ تک پہنچائیں گے۔ موت کے بعد نیک روحیں اہورامزدا کے مسکن میں قیام پذیر ہوتی ہیں۔

اہورامزدا (خدا)

''اہورا'' کا مطلب آقا یا مالک ہے ''مز'' کا مطلب عظیم اور ''دا'' کا مطلب علم ہے چنانچہ اہورامزدا ک امطلب خدائے علیم وخبیر ہوا۔ اہورامزدا مطلق ذہانت ہمہ دان اور تمام راست باز چیزوں اور اچھائیوں کا خالق اور مورث اعلی ہے۔ وہ قادر مطلق ہے جس

کے اختیار میں پوری کائنات کا نظام ہے۔اس نے سورج‘ چاند اور ستاروں کے مدار بنائے ۔فطرت کی تمام تر قوتیں اس کی زیر نگرانی و ہدایت ہیں۔ زرتشت کے مطابق اہورامزدا میں سات خصوصیات ہیں(۱) نور(۲) اچھے خیالات (۳) راستی (۴) اختیار (۵) کرم(۶) رحم اور(۷) لافانیت

مزید برآں یہ کہا گیا کہ اہورامزدا قادر مطلق‘ ہر جگہ موجود‘ حفاظت کرنے والا‘ خالق‘ زندہ رکھنے والا اور علیم وخبیر ہے۔مخلوق میں تمام خیر اور فائدہ بخش چیزیں اس میں ہی صادر ہوتی ہیں۔اور اس کے الٹ ہر چیز اہرمن (شیطان) کی پیدا کردہ ہے۔وہ اپنے سچے پیغام بروں یعنی مقلدین کو حکم دیتا ہے کہ خدا کی مہربانی اور زرتشت کی پرچار کردہ ”زیند اوستا“ میں بیان کردہ مذہب پر کامل یقین رکھیں تاکہ برے افعال اور برے خیالات کا مقابلہ کرسکیں اور خود نیک کاموں میں لگائیں۔

زرتشت مت اہورامزدا میں کامل یقین مکمل اعتماد اور مستحکم وابستگی کا مذہب ہے۔یہ ویدانت کے ہمہ گیر مذہب میں ثنائیت پسند دور (Dualistic Phase) کی راہ بھگتی سے مماثلت رکھتا ہے۔ یہ مالک کل کے حضور بھگت کی جانب سے مسلسل عبادات‘ دعاؤں‘ قربانیوں اور شکر ادا کرنے پر زور دیتا ہے۔

تصدیق شدہ لافانی عظیم فرشتوں کی مجلس ”امیش پنیتا“ نے اہورامزدا کا دربار سجا رکھا ہے۔ان لافانی فنشتوں کی تعداد سات ہے(۱) نیک ارادہ (۲) پاکیزگی (۳) قوت اور اختیار(۴) محبت(۵) صحت(۶) ابدیت اور(۷) آگ ۔

زرتشت مت کے اخلاقی پہلو

ایک اعتبار سے زرتشت مت کوئی فلسفیانہ نظام نہیں بلکہ یقین بھگتی اور اخلاقیات کا الہامی مذہب ہے۔ اہورامزدا اور اس کا پیغام بر زرتشت اور اس مذہب کے دو بنیادی ذرائع ہیں۔پاک روح اچھے خیال‘ نیک اعمال‘ تقویٰ ایمانداری صداقت رحمدلی وغیرہ ہر شخص کی بنیادی اچھائیاں ہیں۔خیرات کو اس مذہب کا ایک اہم جزو بنایا گیا اور غربا کی

خدمت پر بالخصوص زور دیا گیا۔ اس مذہب کی مادی نیکیوں میں خیرات بھی شامل ہے۔ خیراتی اقدامات کے ذریعہ گناہ کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ ''اوستا'' میں تعلیم دی گئی ''روحانی دنیا کے عوض مادی دنیا کی امارتیں حاصل نہ کرو' کیونکہ ایسا کرنے والے شخص کو نور السموات اور نہ ہی اہورامزدا کی بہشت ملے گی''۔

ایک زرتشتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوچ' اقوال میں ہمہ گیر فلاح کا مظاہرہ کرے صداقت ایمانداری' مہمان نوازی' پاکیزگی' والدین کی اطاعت' کینہ پروری' منافقت' طمع' لالچ' کاہلی' لاپروائی اور مذہب میں بے اعتقادی جیسی برائیوں کا خاتمہ کرے۔ مذہب بہترین چیز ہے دنیا کی اعلیٰ ترین فضیلت زرتشتی اخلاقیات کا مطمع نظر ذاتی زندگی کے ہر فعل میں کامل پاکیزگی کا حاصل کرنا ہے۔

اہورامزدا انسان کو بلند ترین مقام تک سرفرازی عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا ارفع ترین مقصد کامل شادمانی حاصل کرنا ہے جس میں اولاً زندگی کو مکمل بنانا اور دوم اہورامزدا کی رفاقت کا لطف اٹھانا ہے۔

زرتشت مت کے صحائف

زیند اوستا کہلانے والے زرتشت مت کے صحائف تین حصوں پر مشتمل ہیں (۱) ویندی داذ قدیم وقتوں کے مذہبی قوانین اور دیو مالائی کہانیوں کا مجموعہ (۲) وسپراد قربانیوں کے لیے عبادت کا مجموعہ اور (۳) یاسنا جس میں بھی اسی قسم کی عبادات اور پانچ گاتھائیں یا بھجن شامل ہیں۔ یہ گاتھائیں قدیم زبان میں لکھی گئی تھیں جو اوستا کی زبان سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ زیند اوستا میں زرتشت اور اس کے خدا اہورامزدا کے درمیان براہ راست گفتگو شامل ہے۔

☆☆☆

کتابیات

Bibliography

Abhedananda, Swami, Complete works of Swami Abhedananda, Ramakrishna Vedanta Math , Calcutta, 1967.

Aurobindo, S., The Life Divine , Tenth Edition, Sri Aurobindo Ashram Pondicherry , 1980.

Aurobindo, S., Essays on the Gita , The Sri Aurobindo Library, Inc, New York, 1960,

Aurobindo, S., A Practical Guide to Integral Yoga, Sri Aurobindo Ashram, Pondicherry, 1967.

Aurobindo, S., Thought and Aphorisms, Sri Aurobindo Ashram, Pondicherry, 1977.

Ananda, Myth, Symbol, Language, Sri Ramakrishna Math, Calcutta, 1980.

Ayer , A.J., Language Truth and Logic, Gollandx. London, 1936.

Ayer, A.J. Philosiphical Essays, Macmillan Press Ltd,. London 1959

Bhat, V.M., Yogic Powers and God Realisation , Bharatiya Vidya Bhavan , Bombay 1964.

Blofeld, J.E.C Behond the Gods, George Allen and Unwin, London, 1974

Budhananda, Swami, The Saving Challenge of Relegion. Ramakrishna, Math Madras, 1980

Britton Karl, Philosophy and the Meaning of Life, Cambridge University Press, New York, 1969

Ben F.K., Language and Relegion, Philosiphical Library, New York, 1957

Braithwaite, R., An Empiricist's Views of the Nature of Religious Belief, Cambridge Universtiy Press, London, 1955

Bahm, A.J., The world's Living Religions Arnold Heinemann Publishers, Pvt, Ltd. New Delhi 1977

Black Max, Language and Philosophy, Ithaca, New York , Cornell University Press London, 1966

Broad C.D., The Mind and its Place in Nature, Routledge & Kegan Paul Ltd, London 1925

Carnap, R., The Logical Syntax of Language, Kegan Paul Ltd, London, 1973

Campbell, J., The Language of Religion, The Bruce Publishing Co. New York, 1971

Collins, J. God in Modern Philosophy, Routledge

and Kegan Paul, Ltd, London, 1960

Copelston F.C, Religion and Philosophy Gill and Macmillan, Dublin, 1974

Clark T.H. Encychlopedia of Religion and Ethics Edinburgh , New York 1925

Collins J., God in Modern Philosophy Regency, Chicago , 1959

Cogley, John, Religion in a Secular Age, The New American Library, New York, 1969

Dasgupta, S.N. History of Indian Philosophy Five Volumes, Cambridge University Press, London, 1955

Dewey John Reconstruction in PhilosophyHenry Holt, New York , 1920

Dewey John A Common Faith New Haven Conn. Yale Universtiy Press London 1934

Ducasse, M., The Logical Statu or God Macmillan, St Martin's Press London, 1973

Edwards R. M. Reason and Religion , Harcourt Brace Jovanovich, Inc, New York, 1972

Edwards , D.M, The Philosophy of Religion, Hutchinson, London, 1966

Flew A (Ed) Nwe Essays in Philosophical Theology

William Clowens and Sons Sc Press Ltd, London 1963

Ferre. F Language , Logic and God. Eyre Spotiswoode, Ltd, London 1962

Ferm, V., (Ed) Encychlopedia of Morals PHilosophical Library Inc, New York, 1965

Findlay, John N. Language Mind and Value Georgw Allen and Unwin Ltd London 1963

Gandhi M.K. Conquest of Self , Bombay 1943

Haer R.M. The Language of Morals Oxford The Clarendon Press, New York 1952

Hiriyanna M. Essays in Indian Philosophy Kavyalaya Mysore, 1952

Hartman N., Ethics George Allan and Unwin London, N.Y 1932,

Hospers John, An Introduction to Philosophical Analysis, Allied Publishers, Pvt Ltd, Bombay 1971

High Dalls M., New Essays on Religious Language, Oxford University Press New York 1969

Hick, J., (Ed) The Existence of God The Macmillan Co, New York 1964

Hick, J, Philosophy of Religion Prentice Hall of India Pvt, Ltd New Delhi 1981

Inge W.R, Cristian Mysticism Rider London 1964

Inge, W.R. Mysticism in Religion Hitchinson University Library London.

James William, The Varieties of Religious Experience David Mckay Co. London 1902

Kant, I., Preof T.K. Abbott Fundamental Principle of the Metaphysics, Longnans. London 1949

Moore, G.E. Principle of Ethica Cambridge University Press London 1922

Moore . G.E., Some Main Problems of Philosophy , Allen and Unwin, London 1955

Muller, F.Max, The Six Systems of Indian Philosophy Longmants, Green Co New York 1899

Mitchell B, (Ed) The Philosophy of Religion Oxford University Press London 1971

Murti T.R.V., The Central Philosophy of Buddhism, Allen and Unwin, London 1955

Murty, K.S., The Indian Spirit Andhra University Press Waltair, 1965

Mohapatra, A.R., Idea of the Inexpressible A Philosophical Analysis Cosmo Publications New Delhi 1984

Martin C.B., Religious Belief, Ithaca, Cornell Universtiy Press, New York 1959

Mourant, J.A., Readings in the Philosophy of Relegion Crowell Collier and Macmillan Inc. 1954

Otto R., The Idea of Holy Harmondsworth London 1959

Otto, R., Mysticism East and West Macmillan and Co, Ltd. London 1932

Philips D.Z,. The Philosophy of Religion Bas Miccall Oxford University Press London 1971

Potter K.H. Presuppositions of India's Philosophies Prentice Hall of India, New Delhi 1965

Patrick G.T.W., Introduction to Philosophy Pontifical Institute of Theology and Philosophy Alwaye 1977

Pike N., God and Evil : Readings on the Theological Problems of Evil Englewoof Cliffs Prentice Hall Inc, 1964

Pike, N., God and Timelessness Toutledge and Kegan Paul London 1970

Russell B, Mysticism and Logic George Allen and Unwin Ltd, London 1927

Ramsey, Inc. T., Religious Language SCM Press London 1957

Radhakrishnan S., Religion in a Changing World, George Allen and Unwin Ltd New York 1967

Radhakrishnan S., Basic Writings of Radhakrishnan (Ed) Dermott, Jaico Publishing House Bombay 1972

Radhakrishnan S., The Hindu View of Life, Macmillan and Co., London.

Smart, N., The Religious Experience of Mankind The Fontana Library Theology and Philosophy. New York 1969.

Stace W.T., Time and Eternity Princeton University New Jercy 1932.

Stace W.T., Religion and the Modern Mind, J Lippon Co, Philadelpha 1952

Spencer S, Mysticism in the world of Religion Penguin Books, Middlesex 1963.

Sharma, D.S., The Upanishads, Bhartiya Vidya Bhavan Bombay, 1975

Sharma C.D., A Critical Survey of Indian Philosophy Motilal Banarasidass Delhi 1976.

Sing R., Glipmpses of World Religions Jaico Books

Bombay, 1957 Titus H, Living Issues in Philosophy American Books New York 1964

Taylor A.E.,Deos God Exist? The Macmillan Company, New York 1945.

Tomlin E.W.F., The Eastern Philosophers Radius Book Hutchinson Co., Ltd., London, 1969.

Urban W.M., Language and Reality, Macmillan & Co, New York, 1939.

Urmoson J.O., Philosophical Analysis The Clarendon Press, London, 1956.

Wood, A.W., Kant's Moral Religion, Cornell University Press London 1970.

Weinberg, J.R., (Ed) Philosophy of Religion, Holt Rinehart and Ston Inc. New York 1971.

William Benton, (Pub) Encyclopedia Britannica London 1974.

Yatiswarananda, Swami, Adventures in Religious Life, Sri Ramakrishna Math, Madras, 1975.

☆☆☆

The End------------------------اختتام